اسلام اپنی نگاہ میں

تصنیف: ولیم چیٹک

ترجمہ

سہیل عمر

حصہ سوئم۔ حصہ چہارم

انٹرنیٹ ایڈیشن ہوسال 2006

www.iqbalcyberlibrary.net

فہرست

حصہ سوم

احسان

باب ہفتم

''احسان'' کی قرآنی بنیادیں

حدیث جبرئیل میں معین کردہ، دین کی پہلی دو جہات یعنی ''اسلام'' اور ''ایمان'' کا جائزہ ہم لے چکے ہیں۔ اب موقع ہے کہ دین کی تیسری اور سب سے گہری جہت ''احسان'' (بحسن وخوبی کرنا، وہ کرنا جو احسن ہو، حسنِ عمل)۔ ہم نے عرض کیا تھا کہ ''اسلام'' کی بحث کا محور عمل ہوتا ہے اور ''ایمان'' کی بحث کا تعلق فہم سے ہے۔ ''احسان'' کے بارے میں جو کچھ کہا جاتا ہے اس کا مرکز ہے انسانی ارادہ اور نیت۔ انسان جو کچھ کرتا ہے کیوں کرتا ہے؟ ''اسلام'' ہمیں یہ بتاتا ہے کہ انسان کو کیا کرنا چاہیے اور ''ایمان'' سے وہ فہم اور ادراک حاصل ہوتا ہے جس سے انسان یہ معلوم کرتا ہے کہ جو وہ کررہا ہے اسے کرنا کیوں ضروری ہے؟ لیکن یہ دونوں اقالیم اس بات سے غیر متعلق ہیں کہ انسان کے محرکِ عمل اور اس کی نفسیاتی کیفیات اور اوصاف کو اس کے عمل اور اس کے فہم سے کیونکر ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے؟ یہ ان لوگوں کا موضوع ہے جو ''احسان'' اور اس سے منسلک تصورات کو نفسِ انسان کی مثالی اور مطلوب صفات کے طور پر ہدفِ توجہ بناتے ہیں۔ اب ہم آپ کے سامنے چند ایسی مثالی صفات رکھتے ہیں جن کو قرآن مجید میں حسنِ نیت اور صحیح محرکِ عمل کے طور پر پیش کیا گیا ہے نیز اسلامی تہذیب نے ان اہداف ومقاصد کو حاصل کرنے کے لیے تاریخ میں جو طریقے اپنائے ان کا بھی تذکرہ کیا جائے گا۔

''احسان'' لفظ اور معانی

حدیثِ جبرئیل میں رسولِ خداؐ نے فرمایا تھا کہ ''احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو جیسے اس کو دیکھ رہے ہو، کہ اگر تم اسے نہیں دیکھتے تو وہ تو تم کو دیکھ رہا ہے''۔ رسولِ خداؐ کے اس قول کے معانی و مضمرات کی تلاش ہم ذرا بعد میں کریں گے۔ پہلے یہ دیکھیے کہ قرآن مجید اور حدیثِ رسول میں ''احسان'' کا لفظ کس طرح استعمال کیا گیا ہے۔

''احسان'' کا لفظ نکلا ہے ''حُسن'' سے جو عنوان ہے ''اچھے ہونے، خوب ہونے، خوبصورت ہونے'' کی صفت کا۔ عربی زبان کی لغات یہ بتاتی ہیں کہ ''حُسن'' کے عمومی معنی ہیں ہر مثبت صفت (بھلائی، اچھائی، جمال و زیبائی، خوشگوار و ہم آہنگ ہونا، توازن و تناسب، مطلوب و گوارا ہونا) اس کے متضاد ہیں ''قبیح'' (ناگوار، کراہت انگیز) اور ''سوء'' (برائی، شر) لغات میں ''حُسن'' کے جو معنی ہیں ان کے مطابق یہ لفظ ''خیر'' کا مترادف نہیں ہے (اس لفظ پر ہم ''شر'' کے مسئلے پر بات کرتے ہوئے بحث کر چکے ہیں)۔ ''حسن'' وہ بھلائی یا اچھی بات ہے جو لازماً طور پر خوبصورت، اور پرکشش بھی ہو جبکہ خیر، وہ بھلائی ہے جس سے کوئی ٹھوس فائدہ پہنچتا ہے خواہ وہ خوبصورت اور پرکشش نہ بھی رہی ہو یا پھر خیر وہ چیز بھی ہے جو صرف اپنے متبادل کے مقابلے میں ''بہتر'' ہو۔ ہم نے یہ بھی عرض کیا تھا کہ ''خیر'' کا لفظ عموماً ایک ایسے اسم صفت کے طور پر استعمال ہوتا ہے جو دوسری صفت سے بہتر اور مفید تر ہو۔

''حُسن'' کو ''جمال'' سے بھی الگ کر کے دیکھنا چاہیے اگرچہ دونوں کا ترجمہ

خوبصورتی، زیبائی کے لفظ سے کیا جاتا ہے۔ "جمال" کا لفظ حدیثِ رسول میں ہم دیکھ چکے "اللہ جمیل و یحب الجمال" (اللہ تعالیٰ جمیل ہیں اور جمال پسند ہیں)۔ جمال کا لفظ بسا اوقات عملی طور پر حسن کے مترادف کے طور پر برتا جاتا ہے۔ بعض لغت نگار حضرات کی رائے ہے کہ اگر بات انسانی خوبصورتی کی ہو رہی ہو تو "حُسن" کا تعلق آنکھوں سے ہوگا اور جمال کا اشارہ ناک کی طرف ہوگا۔ مذہبی اصطلاح میں "جمال" کا کوئی متضاد نہیں بلکہ اسے "جلال" کے تکملے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اس لیے ہمارے ہاں اللہ تعالیٰ کے جمالی نام اور جلالی نام بتائے گئے ہیں۔

قرآن میں "حَسَنَۃ" کا جو لفظ آیا ہے، اس کی اور حُسن کی اصل ایک ہی ہے اور اس کے معنی ہیں "اچھی اور خوبصورت" چیز یا کام۔ "حَسَنَۃ" انسان بھی انجام دیتا ہے اور اللہ کے کام بھی "حَسَنَۃ" ہوتے ہیں لیکن "سَیِّئَۃ" اللہ تعالیٰ سے صادر نہیں ہو سکتا۔

مَآ أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَآ أَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ (٤:٧٩)

تمہیں جو سکھ بھی پہنچتا ہے خدا کی طرف سے پہنچتا ہے اور جو دکھ پہنچتا ہے وہ تمہارے اپنے نفس کی طرف سے پہنچتا ہے۔

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَى الَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (٢٨:٨٤)

جو نیکی کما کر لائے گا تو اس کے لیے اس سے بہتر صلہ ہے اور جو بدی کما کر لائے گا تو بدی کمانے والوں کو وہی بدلے میں ملے گا جو وہ کر کے آئیں گے۔

"حُسن" کے لفظ سے نکلے ہوئے الفاظ میں سے سب سے پر معنی استعمال شائد وہ ہے جو اسمِ صفت "حُسنیٰ" (سب سے خوبصورت، حسین) میں نظر آتی ہے۔ ہم نے عرض کیا تھا کہ قرآن میں چار مقامات پر "اسمائے حُسنیٰ" (اللہ تعالیٰ کے حسین ترین نام) کا ذکر آیا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ صفاتِ خداوندی دیگر ہر شے کی صفات سے زیادہ خوبصورت، دلکش اور قابلِ تعریف ہیں۔ فی الواقع "حُسنیٰ" کی صفت شہادتِ اوّل ہی کا بیان ہے کیونکہ اس کا مطلب ہے کہ اسمائے حسنیٰ میں سے ہر نام ایک ایسی صفت کی طرف اشارہ کرتا ہے جو ہر صفت سے ہر لحاظ سے افضل ہے۔ بلکہ یوں کہیے کہ ہر اسمِ خداوندی کسی ایک ایسی صفت کو بیان کرتا ہے جو صرف اللہ ہی کی صفت ہے۔ اللہ تعالیٰ "جمیل" ہے سو "لا جمیل الا اللہ"۔ اللہ تعالیٰ "جلیل" ہے لہٰذا "لا جلیل الا اللہ"۔ اسی طرح تمام اسمائے حُسنیٰ کلمہ توحید میں رکھے جا سکتے ہیں۔

قرآن مجید نے "حُسنیٰ" کا لفظ صفت کے علاوہ اسم کے طور پر بھی استعمال کیا ہے اور اس کے معنی ہیں "سب سے بہتر، سب سے حسین و خوبصورت" جو ہر خوبی، بھلائی، خوبصورتی اور مطلوبیت کا حامل ہو۔ "حُسنیٰ" اہلِ ایمان کو ملنے والی جزا اور انعام بھی ہے۔ انبیاء کی پیروی کرکے اور "امانتِ حق" کے مطابق زندگی بسر کرنے سے انسان اپنے اندر اللہ کے اسمائے حُسنیٰ کو حقیقت بناتا ہے اور اس طرح ہر اس شے میں شریک ہو جاتا ہے جو "حُسنیٰ" ہے، سب سے اچھی اور خوبصورت ہے۔ مراد یہ کہ "حُسنیٰ" کا لفظ صفاتِ خداوندی کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے اور انسان کے ہدفِ آخرین، اس کی منزلِ مقصود کی جانب بھی یعنی اس فلاح و سعادت کی طرف جس کا اسے اگلے جہان میں تجربہ ہوگا۔

وَأَمَّا مَنْ آمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُ جَزَاءً الْحُسْنَىٰ (۱۸:۸۸)

رہا وہ جو ایمان اور عمل صالح اختیار کرے گا تو اس کے لیے اللہ کے پاس بھی اچھا بدلہ ہے اور ہم بھی اس کے ساتھ آسان معاملہ کریں گے۔

لِلَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمُ الْحُسْنَىٰ وَالَّذِينَ لَمْ يَسْتَجِيبُوا لَهُ لَوْ أَنَّ لَهُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا وَمِثْلَهُ مَعَهُ لَافْتَدَوْا بِهِ أُولَٰئِكَ لَهُمْ سُوءُ الْحِسَابِ وَمَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمِهَادُ (۱۳:۱۸)

جن لوگوں نے اپنے رب کی دعوت کو لبیک کہا، ان کے لیے انجام کار کی فیروز مندی ہے۔ اور جن لوگوں نے اس کی دعوت قبول نہیں کی، اگر ان کو وہ سب کچھ حاصل ہو جائے جو زمین میں ہے اور اسی کے برابر اور بھی تو وہ فدیے میں دے ڈالیں۔ یہی لوگ ہیں جن کا حساب برا اور ان کا ٹھکانا جہنم ہوگا اور وہ کیا ہی برا ٹھکانا ہے!

''احسان'' وہ فعل ہے جس کے معنی ہیں خوبصورت، اچھا اور بھلا کام کرنا یا حسن، بھلائی اور خوبی برقرار رکھنا۔ درج ذیل آیات قرآنی میں اس لفظ کا انگریزی ترجمہ "to do what is beautiful" اور "to make beautiful" سے کیا گیا ہے۔ قرآن میں یہ لفظ اور اس سے بننے والے اسم فاعل ''محسن'' (وہ جو اچھا، خوبصورت کام کرتا ہو) کا استعمال بہت سے مقامات پر کیا گیا ہے۔ غور طلب اور اہم بات یہ ہے کہ اکثر یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے عمل کی طرف اشارہ کرنے کے لیے استعمال ہوا ہے اور ''محسن'' اللہ کے ناموں میں سے ایک نام

ہے۔ اللہ تعالیٰ کے "احسان" (اچھا، خوبصورت کام کرنا) کا آغاز تخلیقِ کائنات سے ہی ہو جاتا ہے اور اس عملِ تخلیق کا سرتاج نوعِ انسان کو بنایا گیا جسے صورتِ خداوندی پر خلق کیا گیا، وہ صورت جو حُسنٰی اور خوبصورت ترین ہے۔

ذٰلِكَ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۔ الَّذِيْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ۔ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ۔ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ (۳۲:۶-۹)

وہ غائب و حاضر کا جاننے والا، غالب اور مہربان ہے، جس نے جو چیز بھی بنائی ہے خوب بنائی ہے! اس نے انسان کی خلقت کا آغاز مٹی سے کیا، پھر اس کی نسل حقیر پانی کے خلاصے سے چلائی، پھر اس کے نوک پلک سنوارے اور اس میں اپنی روح پھونکی اور تمہارے لیے کان، آنکھیں اور دل بنائے۔ تم بہت ہی کم شکرگزار ہوتے ہو!

اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّالسَّمَاۗءَ بِنَاۗءً وَّصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۭ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ښ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ (۴۰:۶۴)

اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو مستقر اور آسمان کو چھت بنایا۔ اور تمہاری صورت گری کی تو تمہاری صورتیں اچھی بنائیں، اور تم کو پاکیزہ چیزوں کا رزق بخشا۔ وہی اللہ تمہارا خداوند ہے۔ پس بڑی ہی بابرکت ذات ہے اللہ، عالم کے خداوند کی! وہی زندہ ہے، اس کے سوا کوئی معبود

چاہتا ہے۔

لیکن یہ حسنِ عمل، خوبصورت کام انسان اس وقت تک انجام نہیں دے سکتا جب تک اللہ تعالیٰ کی مدد شامل نہ ہو۔ آخری بات یہی ہے کہ انسانی عمل کا آغاز بھی اللہ کے حکم ہی سے ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر شے کو خوبصورت بنایا جیسا کہ اس نے ہر شے کو "مسلم" (مطیع و فرمانبردار بنایا)۔ لیکن جب تک اس کی ہدایت نہ ہو انسان "مسلم" نہیں بن پاتا اسی طرح جب تک اس کی برکت و رحمت نہ ہو انسان کے قبیح اوصاف و اخلاق صفاتِ حمیدہ و پسندیدہ میں تبدیل نہیں ہو پاتے۔ اس سے آنحضرتؐ کی اس دعا کا مفہوم سمجھ میں آتا ہے "یا رب، تو نے میری تخلیق کو حسن دیا، سو میرے خُلق کو بھی حسین بنا دے"۔

قرآن مجید نے بار بار انسان کو یہ حکم دیا کہ وہ حسنِ عمل، "احسان" اختیار کرے، اور ساتھ ہی یہ وعدہ بھی کیا کہ جو لوگ اچھے خوبصورت عمل کریں گے ان پر اللہ کے اسمائے جمالیہ، اسمائے رحمانیہ اور اسمائے حسنیٰ کی عنایات ہوں گی۔ درج ذیل آیات اس اعتبار سے خصوصاً اہم ہیں کیونکہ ان میں "احسان" اور "حسنیٰ" کا باہمی تعلق واضح نظر آتا ہے۔ ہمیں یاد دلایا گیا ہے کہ جس بات میں، جس کام میں برائی ہو، قباحت ہو اس کی سزا تو صرف اس کے برابر ہوگی لیکن حسن و خوبی کے کاموں کی جزا نہ صرف اس کے برابر ہوگی بلکہ کئی گنا بڑھا کر دی جائے گی۔ انسانی صفات کو حقیقت ملتی ہے تو اللہ کی صفاتِ حسنیٰ کے ذریعے۔ جب انسان اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے تو اس کی صفاتِ حمیدہ کو اللہ کی صفات سے جدا کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوْا

والے لوگ) کا ذکر آیا ہے جنہیں اچھے اور قابلِ تعریف انسانوں کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ جنہیں اللہ کی صفت احسان میں سے حصہ ملا ہے اور اسی لیے وہ اللہ سے قریب تر ہیں اور اس کی رحمت و جمال میں شریک ہوتے ہیں۔ چونکہ وہ احسان کرتے ہیں لہٰذا خود بھی محسن ہیں یعنی اور خوبصورت کام کرنے والے خود بھی تو اچھے اور خوبصورت ہوتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں یہ دیکھ کر تعجب نہیں ہونا چاہیے کہ جن سولہ آیات میں یہ ذکر آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں سے محبت کرتے ہیں ان میں سے ۵ میں ایسے لوگوں کو محسنین (احسان والے لوگ) کہہ کر پکارا گیا ہے جبکہ باقی گیارہ آیات میں ان کو دیگر اچھی اور خوبصورت صفات سے مزین بتایا گیا ہے (اس نکتے کی معنویت پر اس وقت غور کریں گے جب محبت کے بارے میں بات کی جائے گی)۔

إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوا وَّالَّذِينَ هُم مُّحْسِنُونَ

(۱۶ : ۱۲۸)

بے شک اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا اور جو محسن ہیں

وَأَحْسِنُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ (۲ : ۱۹۵)

اور احسان کرو بے شک اللہ احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ (۵ : ۱۳)

تو ان کو معاف کر دو اور (ان سے) درگزر کرو کہ بے شک اللہ احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

جائیں تو دوسری طرف یہ حکم انسانوں سے یہ تقاضا کرتا ہے کہ وہ اپنے اخلاق و کردار درست کریں کہ انہیں بھی کریم و رحیم و رحمان وغیرہ کے ناموں سے پکارا جا سکے جو اللہ تعالیٰ کے خوبصورت ناموں میں سے ہیں۔ ''آخرت'' کے باب کے آخر میں جو طویل حدیث ہم نے نقل کی تھی اس میں ذکر ہے کہ موت کے بعد انسانوں کو اچھے اور خوبصورت یا برے اور قبیح ناموں سے پکارا جائے گا جن سے اس دنیا میں انہیں یاد کیا جاتا تھا اور یہ نام اس بنا پر تھے کہ ان میں یہ صفات و اوصاف پائے جاتے تھے

اسلام کے تناظر میں ''حُسن'' کی کیا اہمیت ہے اس کا اندازہ اس بات سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ رسولِ خدا ﷺ کے دونوں نواسوں کا نام حَسن اور حُسین تھا۔ یہ لفظ ''حُسن'' ہم پہلے دیکھ چکے ہیں جو ''حَسُنَ'' سے اسم صفت بنایا گیا ہے۔ ''حسین'' اسی لفظ کا اسم تصغیر ہے سو اگر ان دو الفاظ کا ترجمہ کرنا ہو تو کچھ یوں ہو گا کہ ''حسن'' اور ''ننھا حسن''۔ مغرب میں ان ناموں کو مردوں کے لیے موزوں نہیں سمجھا جائے گا۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ مغرب اور اسلام کے تصورات میں کتنا فرق ہے۔ اس حقیقت سے یہ بات یقینی ہے کہ یہ دونوں نام رسولِ خدا ﷺ نے خود چنے تھے یا کم از کم پسند ضرور کیے تھے۔

''حُسن'' کے بارے میں سب سے دلچسپ حدیث درج ذیل ہے۔ یہ حدیث تقریباً سبھی صحیح مجموعوں میں موجود ہے:

اللہ تعالیٰ نے ہر ایک پر حسن کی تاکید کی ہے۔ جب تم قتل کرو تو خوبصورتی سے کرو اور جب تم ذبیح کرو تو خوبصورتی سے کرو۔ ہتھیار کی دھار خوب تیز رکھا کرو تاکہ اذیت کم ہو۔

پہلا فقرہ خاص طور پر اہم ہے کیونکہ اس میں ایک عالمگیر عمومی قاعدہ مقرر کیا گیا ہے۔ جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کو ایک حسن عطا کیا ہے اسی طرح انسانی عمل کو بھی بحسن و خوبی انجام پانا چاہیے کیونکہ اس پر بھی نمونہ خداوندی کا اتباع کرنا لازم ہے۔ اس کے بعد حدیث اس خاص واقعہ کی طرف اشارہ کرتی ہے جس کے بارے میں صحابہؓ کو ارشاد فرمایا گیا تھا۔ رسول خداؐ اپنے صحابہ سے ارشاد فرما رہے ہیں کہ وہ قرآن پڑھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ قرآن نے "احسان" کا امر فرمایا ہے۔ انہیں یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ وہ کام جنہیں عموماً برا کام نہیں گردانا جاتا ان کا اس حکم سے کوئی تعلق نہیں۔ کسی کو قتل کرنا عام طور پر ایک قبیح فعل ہے اور کسی جائز اور منصفانہ سبب کے بغیر ایک انسان کو مار دینا کسی شخص کو بھی جہنم رسید کرنے کے لیے کافی ہے۔

مَن قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا (۵:۳۲)

جس نے کسی انسان کو قتل کیا بغیر اس کے کہ اس نے کسی کو قتل کیا ہو یا فساد کیا ہو

تو گویا اس نے سب کو قتل کیا

اسی طرح اپنی غذا بنانے کے لیے جانوروں کو ذبح کرنا بھی ایک ایسا کام ہے جو اکثر لوگوں کے لیے کچھ خوشگوار اور باعث کشش نہیں ہوتا اور طبیعت کا یوں بار آنا سمجھ میں بھی آتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس بات کی اجازت دے رکھی ہے لہٰذا اسے کرنا ہو تو اسے بہتر طریقے سے کرنا چاہیے

حدیث کے تیسرے فقرے میں رسول خداؐ نے ایک مثال دی ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ اس سیاق میں "احسان" (حسن عمل) کا کیا مطلب ہو گا جہاں ایک گونہ قساوت ناگزیر طور پر موجود ہو۔ چاقو کی دھار تیکھی ہونا چاہیے تاکہ جانور کا گلا جلدی

سے کٹ جائے اور اسے تکلیف نہ ہو۔ اسی طرح اگر معاملہ انسان کے قتل کا ہو، خواہ معرکۂ جنگ میں ہو یا دفاع وسزا کے لیے تو اس کے لیے بھی تیز دھار تلوار استعمال کرنا چاہیے۔ شریعت میں جنگ کے بارے میں جو بہت سی ہدایات اور ممنوع چیزیں بیان ہوئی ہیں تیز دھار تلوار کا حکم ان سے غیر متعلق نہیں ہے۔ ان ہدایات کی ایک مثال یہ ہے کہ عورتوں، بچوں، راہبوں اور پادریوں اور بالعموم جنگ آزمائی نہ کرنے والوں کو نقصان نہ پہنچانے کا حکم دیا گیا ہے۔ (اس کا اس مثے کا مطلب یہ ہو کہ جدید آلاتِ جنگ اور اسلحے میں جتنے ایسے وسائل پیدا ہوئے ہیں جو وسیع پیمانے پر تباہی پھیلاتے ہیں ان کا استعمال شریعت کی نظر میں ممنوع ہے)

عبادت

قرآن مجید اور رسول خداؐ نے ”احسان“ کو ایک بڑی خوبی اور انسانی صفت میں سے نہایت پسندیدہ صفت قرار دیا ہے۔ قرآن میں ’احسان‘ کا تعلق ہر اس شے سے ہے جو اچھی اور قابل تعریف ہو۔ صاحب ’احسان‘ جنت کا مستحق کہا گیا ہے۔ حدیث جبرئیل میں آنحضرتؐ نے ”احسان“ کی جو تعریف متعین کی ہے وہ خاص طور پر غور طلب ہے کیونکہ اس سے ہمیں اس صفت کی باطنی جہت اور اس کی نفسیات کے بارے میں ایک بصیرت حاصل ہوتی ہے۔ اس سے ان انسانی رویوں، محرکات اور نیتوں کی وضاحت ہوتی ہے جو ”احسان“ کا لازمہ سمجھے جا سکتے ہیں۔ آئیے عبادت کے لفظ پر پہلے غور کرتے ہیں۔ ”احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو“۔ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ ”عبادت“ کے لفظ کی اصل وہی ہے جو ”عبد“ (بندہ، خادم) کی ہے۔ اس کا ترجمہ ”بندگی کرنا، بندہ بننا“ کے طور پر کیا جا سکتا ہے۔ اللہ کی عبادت کا مطلب ہے اس کی

بندگی کرنا اور اس کے کہے پر چلنا، اس کا حکم بجا لانا۔ یہاں ذکر اضطراری بندگی کا نہیں ہو رہا جو درج ذیل آیت میں بیان ہوئی ہے۔

إِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ إِلَّا آتِي الرَّحْمَٰنِ عَبْدًا (۱۹:۹۳)

آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں، سب خدائے رحمان کے حضور بندے کی حیثیت سے حاضر ہوں گے۔

بلکہ "حسنات" اس بندگی کا تقاضا ہے جو اپنے اختیار سے، آزادانہ مرضی سے اور پورے اخلاص سے کی جائے۔

اسلامی کتب میں "عبادت" کا لفظ جب ایک محدود معنی میں استعمال ہوتا ہے تو اس سے مراد ہوتے ہیں دین کے پانچ ستون (ارکان خمسہ) اور دیگر اعمال جیسے ذکر و فکر خدا، یہ تمام عمل مراسم عبودیت اور پرستش کی نوع کے ہیں۔ اس معنی میں لفظ کو اکثر جمع (عبادات) کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ یہاں اس کا ترجمہ "اعمال عبادت" کے الفاظ سے کیا جا سکتا ہے۔ فقہ میں انسانی عمل کو عموماً دو بڑی اقسام میں بانٹ کر دیکھا جاتا ہے۔ "عبادات" اور "معاملات"۔ پہلی قسم یعنی عبادات وہ مراسم اور مذہبی معمولات ہوئے جو انسان کا تعلق اللہ سے جوڑتے ہیں جبکہ "معاملات" کا ربط انسانوں کے باہمی تعلقات یعنی شادی، بیاہ، میراث، لین دین وغیرہ سے ہے اور ان کو بھی اللہ کے احکامات کے مطابق انجام دینا چاہیے۔

قرآن میں "عبادت" کا لفظ ان پانچ ارکان دین کی بجا آوری سے کہیں زیادہ وسیع مفہوم میں آیا ہے۔ اس لفظ کا مطلب ہے کسی کو اپنا خدا بنا لینا اور پھر اس

الا عباد اللہ المخلصین ، اولئک لہم رزق معلوم ، فواکہ وہم مکرمون ، فی جنات النعیم (۳۷ : ۴۰-۴۲)

بے شک مگر اللہ کے خالص بندے اس سے بچے ہوں گے، ان کے لیے مقرر رزق ہے، ہر طرح کے پھل اور وہ عزت کے ساتھ رہیں گے، نعمت کے باغوں میں خوشیاں منائیں گے۔

دیدارِ حق Seeing God

رسولِ خدا ﷺ نے احسان کی جو تعریف کی: "احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو جیسے تم اسے دیکھ رہے ہو، اگر تم اسے نہیں دیکھتے تو وہ تمہیں دیکھ رہا ہے"۔ یہاں آپ ﷺ کے قول کا مرکز وہ رویہ اور نیت ہے جو انسان کے ظاہری عمل کے پس پشت کارفرما ہوتا ہے جس کا تقاضا "اسلام" نے کیا ہے۔ یہ نکتہ آسانی سے سمجھ میں آ جاتا ہے اگر یہ غور کیا جائے کہ ہم روزمرہ کے کام کس طرح کرتے ہیں۔ مثلاً، قانون ہم سے کہتا ہے کہ مقررہ رفتار سے تیز گاڑی نہ چلائیں۔ بہت سے لوگ اس قانون کی پابندی کرتے ہیں لیکن ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو صرف اس خوف سے قانون کی پابندی کرتے ہیں کہ اگلے موڑ پر پولیس کے گشتی دستے کا سامنا نہ ہو جائے اور اگر ٹریفک میں ان کے پیچھے پولیس کی گاڑی آ رہی ہو تو وہ رفتار کی حد سے تجاوز کرنے کا سوچتے بھی نہیں۔

رسولِ خدا ﷺ کے فرمان کا مطلب یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرے یعنی پانچ ارکانِ دین بلکہ اپنا ہر کام یوں سمجھ کر کرے گویا اللہ تعالیٰ پولیس کار میں ان کا پیچھا کر رہے ہوں۔ اگر آپ پولیس کی پٹرول کار کو دیکھ نہیں رہے تو بھی آپ کو یقینی طور پر یہ معلوم ہے کہ اللہ کے پاس ایسے وسائل ہیں جن کی پہنچ کے کوئی

شخص، یہ نہیں ہو سکتا۔ نہ اس کی نگاہ کو کوئی بھی رکاوٹ کسی طرح روک سکتا ہے۔

وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنتُمْ (۵۷:۴)

اور وہ تمہارے ساتھ ہوتا ہے جہاں کہیں بھی تم ہوتے ہو اور اس سے کوئی

بات چھپ نہیں سکتا۔

جو رویہ ''احسان'' کے لیے درکار ہے اس پر ''تنزیہ'' کا اطلاق بھی ہوتا ہے اور ''تشبیہ'' کا بھی اور تشبیہ و تنزیہ کا بر امتزاج بھی۔ گذشتہ سطور میں ہم نے جو گشتی پولیس کا ذکر کیا تھا اس میں اشارہ تھا قہر اور غضب کی طرف یعنی صفات تنزیہ۔ ''السلطان ظل اللہ'' (سلطان اللہ کا سایہ ہوتا ہے) مطلب یہ ہو کہ خدا جیسا ہو بادشاہ اور حکمران۔ پولیس سلطان کا دست و بازو ہوتی ہے۔ قانون کا سختی سے نفاذ کرانے والے لوگ۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھیے تو انسان اللہ کی عبادت اس لیے کرتا ہے کہ اگر اس نے اللہ کی جاری کردہ ہدایات کی پابندی نہ کی تو اس کے پاداش میں سزا بھگتنا ہو گی۔ انسان رب العالمین کا بندہ ہے اور اس کو اللہ کا حکم ماننا ہے ورنہ قید کی سزا ہو جائے گی، اس کا ٹھکانہ ''سجین'' (مطففین) ہو گا، جہنم کا پست ترین درجہ

لیکن ہر عمل کا محرک خوف ہی تو نہیں ہوتا۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان محبت کی وجہ سے نیک کام کرتا ہے اور اپنے مقصود کا قرب حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس صورت میں محرک عمل اور نیت وہ امید اور بھروسہ ہوتا ہے جو صفات تشبیہ پر اپنی اساس رکھتا ہے مثلاً رحمت، کرم، جمال۔ جب ایک نوجوان اپنی محبوبہ کی فرمائش پوری کرنے کی کوشش کرتا ہے تو محبوب سے شادی کرنے کی خواہش اس کے عمل کو حرکت میں لانے کا باعث ہوتی ہے۔ اس کے سامنے ایک مقصد ہے جسے وہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ایک بات یقینی ہے کہ اگر محبوب اس کے پاس ہو تو اس کا رد عمل کچھ اور ہو گا اور

اگر وہ اپنے خاندان کے ساتھ اگر کہیں باہر چلی جائے تو یہ گھر ویران ہو جائے گا۔ قدرتی بات ہے کہ جب محبوب سامنے نہ ہو تو ہماری کاوشیں سست پڑ جاتی ہیں۔ محبوب واپس آ جائے تو کوشش میں پھر سے جان پڑ جاتی ہے۔

ان دو مثالوں میں عمل کا محرک ہے نقصان کا خوف اور کسی شے کے حصول کی امید۔ لیکن بہت سے مسلمان علماء کی رائے ہے کہ 'اللہ کی عبادت اس طرح کرنا جیسے آپ اسے دیکھ رہے ہوں' کا مطلب یہ ہے کہ فائدے اور نقصان کی ہر سوچ کو بھلا کر اللہ کی عبادت کی جائے۔ تاہم یہ جاننا کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ الحق ہے اور بندہ بے حقیقت۔ انسان کو چاہیے کہ اپنے آپ کو الحق پر مرکوز رکھے اور بے حقیقت کو فراموش کر دے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ انسان کو اپنی کوئی بھی سوچ اپنے بارے میں کوئی غرض نہیں ہونا چاہیے۔ اسے صرف اللہ ہی کا دھیان ہونا چاہیے۔ یہ ہے ذکرِ حق کا نقطۂ کمال۔ جو شخص دور ہو اس کو یاد کرنا کچھ اور ہوتا ہے اور جو پاس موجود ہو اس کا ذکر کچھ اور معنی رکھتا ہے۔ اللہ کے حضور میں سر کرنے والے نہ صرف دائمی طور پر اس کا ذکر کرتے ہیں، اس کی یاد میں رہتے ہیں بلکہ اسے شاید کبھی بھلا نہیں سکتے

احسان کی تعریف یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو جیسے اس کو دیکھ رہے ہو کیونکہ اگر تم اسے نہیں دیکھتے تو وہ تم کو دیکھ ہی رہا ہے۔ 'وہ آپ کو یہاں سے دیکھ رہا ہے' کہ انسان جہاں بھی ہو اللہ اس کے ساتھ ہوتا ہے لیکن یاد رہے کہ اس تعریف میں یہ بھی ہے کہ ''اگر تم اسے نہیں دیکھتے'' اگر ہم اسے دیکھ سکتے تو کیا ہوتا؟ یہی عبادت کا مقصود اور اس کی منزل ہے۔ ایسا ہو جائے تو انسان کی عبادت بلاشبہ صرف اور صرف اللہ ہی کے لیے ہوگی۔

انسان اللہ تعالیٰ کو کیسے دیکھ سکتا ہے؟ یہ ایک پیچیدہ سوال ہے۔ ایک ایسا سوال جس پر فکر اسلامی کی پوری تاریخ میں ہمیشہ بحث اور اختلاف رائے ہوتا رہا ہے۔ مختصر یہ کہا جا سکتا ہے کہ علماء نے اس سوال کے مختلف جواب دیے ہیں۔ ان کا نقطۂ نظر تنزیہ پر مبنی ہو تو جواب ایک طرز کا ہوگا اور اگر غلبہ تشبیہ کو حاصل ہو تو جواب کسی اور طرح دیا جائے گا۔ ماہرین علم کلام کے ہاں چونکہ زور تنزیہ پر رہا ہے لہٰذا ان کی رائے میں اس دنیا میں اللہ کو دیکھنا محال ہے اگرچہ ان میں سے اکثر حضرات یہ مانتے ہیں کہ اگلے جہان میں ہم اللہ کو دیکھ سکتے ہیں اور دیکھیں گے۔ ان کے برعکس اہلِ تصوف کا زور تشبیہ پر رہتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس دنیا میں بھی اللہ کو دیکھا جا سکتا ہے لیکن چشمِ سر سے نہیں دل کی آنکھ سے۔ تاہم صوفیاء کی اکثریت کا کہنا بھی یہی ہے کہ اس دنیا میں یا آخرت میں، انسان اللہ تعالیٰ کو اس طرح نہیں دیکھ سکتا جیسے کہ وہ خود کو دیکھتا ہے۔ انسان کے لیے دیدارِ خداوندی صرف تجلی اور رویت ہی ہے جیسے کہ اللہ تعالیٰ دکھانا چاہے۔ اگر "وھو معکم اینما کنتم" (تم جہاں بھی ہو وہ تمہارے ساتھ ہے) تو پھر آپ اس کو اسی حد تک دیکھ سکتے ہیں جس حد تک "وہ" آپ کے ساتھ ہے لیکن لازم نہیں کہ آپ اسے اس طرح دیکھ سکیں جیسے وہ دوسرے سے دیکھتے ہیں یا جیسے وہ فرشتوں کے سامنے ظاہر ہوتا ہے اور جس طرح وہ اپنے پہ ظاہر ہوتا ہے اسے تو انسان ہرگز نہیں دیکھ سکتا۔

کہا جا سکتا ہے کہ "احسان" کا مقصود یہ ہے کہ اللہ کی عبادت اس کو واقعی دیکھتے ہوئے کی جائے۔ اس ہدف اور اس مطمحِ نظر کی اہمیت اس وقت واضح ہوگی جب ہم یہ یاد کریں کہ جنت کی سب سے بڑی سعادت دیدارِ حق ہے، اللہ کی دید۔ رویتِ باری اور دیدارِ حق سے بڑھ کر اگلے جہان میں اور کوئی چیز نہیں ہے۔ اسی

طرح اس دنیا میں بھی "احسان" کے ذریعے حاصل ہونے والی دید و دست سے بڑھ کر اور کوئی شے نہیں ہو سکتی۔

اخلاص

"احسان" یہ ہے کہ انسان یوں عمل کرے گویا اللہ کو دیکھ رہا ہے۔ اس کیفیت میں انسان کا ادراک یہ ہوتا ہے کہ اللہ سے کچھ بھی چھپا ہوا نہیں ہے۔ لیکن یہاں مقصود صرف اتنا نہیں ہے کہ اللہ نے جو حکم دیا ہے اس کے مطابق عمل کیا جائے بلکہ یہ کہ ہر کام اللہ کی خاطر کیا جائے۔ یہ ہے توحید فی العمل۔ توحید کا عملی اظہار۔ چونکہ حق کے سوا اور کوئی حقیقت نہیں ہے سو ہر عمل اور ہر سوچ حق کے مطابق ہونا چاہیے، اس مطابقت کے حصول کا ایک محرک یہ ادراک بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ حاضر و ناظر ہے جس کا مطلب یہ ہو کہ وہ نہ صرف انسان کے ہر عمل کو دیکھ رہا ہے بلکہ یہ بھی کہ انسان کی ہر سوچ بھی اس سے اوجھل نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر بات کا عالم ہے کیا عیاں اور کیا پنہاں کھلا اور چھپا سب کچھ اس کے سامنے ہے اور ہمارے سب سے مخفی خیالات بھی اس سے پوشیدہ نہیں ہیں۔

وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا فِي قُلُوبِكُمْ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَلِيمًا

(۳۳: ۵۱)

اور اللہ جانتا ہے جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے۔

أَوَلَيْسَ اللَّهُ بِأَعْلَمَ بِمَا فِي صُدُورِ الْعَالَمِينَ (۲۹: ۱۰)

کیا دنیا والوں کے دلوں میں جو کچھ ہے اللہ اس سے اچھی طرح باخبر نہیں ہے؟

يَعْلَمُ مَا تُخْفُونَ وَمَا تُعْلِنُونَ (۲۷: ۲۵)

وہ جانتا ہے جو کچھ تم چھپاتے ہو اور جو ظاہر کرتے ہو۔

"احسان" کا تقاضا ہے کہ انسان اس بات سے آگاہ رہے کہ وہ ہر لمحہ اللہ کی نگاہ میں ہے اور اس کا عمل اللہ کے حاضر و ناظر ہونے کے مطابق ہو۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ "احسان" یہ بھی چاہتا ہے کہ انسان کی سوچ، احساس اور نیت بھی اس کے مطابق ہو۔ ظاہری عمل درست ہو جائے بس صرف اتنا کافی نہیں ہے (یہ صرف ایک سطح ہو گی یعنی "اسلام") بلکہ اندر کی سوچیں اور رویے بھی خارجی عمل کے عین مطابق ہونے چاہئیں۔ انسان کی سوچ اور اس کے عمل میں تضاد نہیں ہونا چاہیے یا یوں کہیے کہ انسان جو ہے اور جو سوچتا ہے اس میں فرق نہیں ہونا چاہیے۔ انسانی شخصیت کو ہم آہنگ، متوازن اور سالم و مکمل ہونا چاہیے، بغیر ایسے رجحانات اور ذہنی محرکات کے جو اسے مختلف سمتوں میں کھینچ رہے ہوں۔

انسانی ذات کی اس ہم آہنگی کو اکثر "اخلاص" کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ انگریزی میں اسے عموماً Sincerity کے لفظ سے ترجمہ کیا جاتا ہے۔ "اخلاص" جیسے ظاہر میں ہونا چاہیے ویسے ہی باطن میں بھی۔ جب ایک مخلص آدمی کچھ کہتا ہے تو اس کے الفاظ سچے ہوتے ہیں اور اس کے فہم اور اس کے ایمان کے عین مطابق ہوتے ہیں۔ اسی طرح انسان مخلص ہو تو اس کا عمل اس کے وجود اور اس کے احساس کا عکس ہوگا، جیسا وہ ہوگا اور جو اس کا سچا احساس ہوگا وہی اس کے عمل میں ظاہر ہوگا۔

انگریزی کا لفظ Sincerity ان سے ذرا ڈھیلے ڈھالے معنی میں استعمال ہوتا ہے عربی میں ایسا نہیں ہے۔ "اخلاص" کا لفظ اس طرح ڈھیلے ہوئے مفہوم میں کبھی نہیں برتا جاتا۔ آجکل کے انگریزی روزمرہ میں تو Sincerity ایک بہانہ ہے ہر وہ کام کرنے کا جو کر کے مزہ آتا ہو۔ اپنی مرضی کرنا، اپنے من کی موج میں رہنا۔ مگر

آپ Sincere ہیں یعنی آپ کے جی میں جو کچھ ہے اس سے سچے ہیں تو پھر آپ جو کچھ بھی کیا کریں وہ ٹھیک ہے۔ معاملے پر اس انداز میں نظر کرنا اسلامی فکر کے نقطۂ نظر سے ایک بالکل اجنبی چیز ہے کیونکہ اخلاص تو اللہ تعالیٰ کی نسبت سے اور اس کی ذات کے لیے ہے۔ اور یہ خاص قسم کا "اخلاص" Sincerity جو ہم نے ابھی ذکر کیا ایک جھوٹے خدا سے مخلص ہونے کے مترادف ہے۔ اس جھوٹے خدا جسے قرآن نے "ہوا" کا نام دیا ہے سو یہ شرک ہی کی ایک صورت ہے

"اخلاص" کے معانی پر غور کرنا ہو تو اس کے متضاد الفاظ کو دیکھنا چاہیے۔ یہ لفظ سب سے پہلے تو متضاد ہے "نفاق" کا۔ "نفاق" کا ترجمہ انگریزی میں Hypocrisy کے لفظ سے کیا جاتا ہے لیکن اس کا مادہ یا جڑ جن حروف سے ہے اس کے معنی ہیں "بیچنا، فروخت کرنا"۔ اس کے لفظی معنی ہوئے "اپنے آپ کو بیچ ڈالنے کی کوشش"۔ اسلام کے نقطۂ نظر سے منافق وہ شخص ہے جو لوگوں کو وہ بن کر دکھا رہا ہو جو وہ نہیں ہے، جو لوگوں کو قائل کرنا چاہے کسی ایسی چیز کے لیے جو ان میں نہیں ہے یعنی وہ مال فروخت کرنا چاہتا ہے جو ویسا ہے نہیں جیسا نظر آتا ہے

مدینہ کے اسلامی معاشرے میں ایک گروہ تھا جو "منافقین" کے نام سے معروف تھا۔ ان کا ایک خاص کردار تھا۔ اوپر اوپر سے انہوں نے اسلام تو قبول کر لیا تھا لیکن ان کی اصل دلچسپی صرف اپنی ذاتی اغراض سے تھی۔ ان کی تکمیل ان کا مقصد تھا۔ وہ نہ تو اللہ پر ایمان رکھتے تھے نہ اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر۔ لیکن ان کی نظر اس بات پر تھی کہ ان حالات میں نئے دین کی پیروی کرنا ان کے لیے سودمند رہے گا۔ قرآن مجید نے اکثر اس گروہ کی طرف اشارہ کرنے کے لیے "منافق" کا لفظ استعمال کیا ہے اور کئی آیات میں اس گروہ کا صراحتاً ذکر آیا ہے۔ قرآن مجید نے

عملِ خالص وہ ہے جو صرف اللہ کی خاطر کیا جائے۔ مثال کے طور پر قرآن میں زکوٰۃ کے لازمی فریضے کے علاوہ بھی خیرات اور انفاق کی تاکید کی گئی ہے۔ اب اگر یہ صدقہ اور خیرات اللہ کے لیے ہے تب تو یہ سچا انفاق ہے لیکن اگر اس میں یہ نیت پنہاں ہو کہ لوگ مجھے سخی اور نیک دل سمجھیں گے تو یہ عمل ریاکاری پر مبنی ٹھہرے گا۔ مزید برآں یہ خیال رکھنا بھی ضروری ہے کہ جن لوگوں کو خیرات دی جا رہی ہے ان کی سُبکی نہ ہو کیونکہ اصل میں تو یہ تحفہ ان کو اللہ کی طرف سے مل رہا ہے۔ اس خیر کے کام کے لیے انہیں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے لیکن اگر آپ کی کوشش یہ رہی کہ ان کو اپنا مرہونِ احسان بنائیں تو آپ کا عمل، آپ کا کارِ خیر نیت کی خرابی سے داغدار ہو جائے گا۔ آپ بھی اور وہ بھی، دونوں توحید کو بھلا دیں گے۔

اس سیاق و سباق میں قرآن نے بسا اوقات "مَنّ" کا لفظ بھی استعمال کیا ہے جس کا مطلب ہے "یہ کوشش کرنا کہ لوگ آپ کے احسان مند رہیں، بار منتِ احسان اٹھاتے رہیں" مثلاً آپ نے اپنے دوست کو ایک اچھا سا ڈسک پیپر سالگرہ کے تحفے میں دیا۔ پھر آپ ہر موقع پر یہ جتاتے رہے کہ آپ کتنے کشادہ دست اور دینے والے ہیں تاکہ اپنے لیے کوئی مفاد حاصل کر سکیں یا صرف اتنی ہو کہ آپ کے اندر ایک طمانیت پرورش پاتا رہے کہ واہ بھئی میں کیسا اچھا اور شاندار آدمی ہوں۔ اپنے دوست سے اس طرح کا برتاؤ یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ تحفہ اصل میں تحفہ نہیں تھا، توقعِ مفاد کے لیے سرمایہ کاری تھی۔ قرآن مجید نے کھلے لفظوں میں اس قسم کے خود نمایانہ عمل کی ممانعت کی ہے اور یہ کہا ہے کہ دوسروں پر اس طرح احسان جتانا اور اپنی مہربانیوں کا بار بار تذکرہ کر کے انہیں شرمندہ کرنا اور دکھ دینا ایسا ہی ہے جیسے اس تحفے کو برباد کر دینا۔

یاد رہے کہ قرآن مجید نے کہا ہے کہ منافقوں کا ٹھکانا جہنم کا سب سے گہرا گڑھا ہوگا۔ مسلمانوں کی نظر میں منافقت کیسی قبیح چیز ہے اور اس کے برعکس خلوص کیسی اچھی اور پسندیدہ صفت ہے اس کا ہمیں یقینی طور پر پتہ چل جاتا ہے۔ ایک حدیث میں یہی بات قدرے زیادہ آرائشی زبان میں بیان کی گئی ہے۔[1]

رسول خداؐ ایک روز اپنے چند صحابہ کے ساتھ تشریف فرما تھے کہ زور کی ایک دھمکا سنائی دی۔ آنحضرتؐ کے ساتھی لوگ چونک اٹھے۔ ادھر ادھر نظر دوڑاتے ہوئے صحابہ میں سے ایک آدھ نے پوچھا "یہ کیا؟" آنحضرتؐ نے اطمینان سے فرمایا "یہ اس پتھر کی آواز تھی جو ستر موسم قبل دوزخ میں پھینکا گیا تھا اور اب جا کر تہہ میں گرا ہے"۔ صحابہؓ حیرت سے ایک دوسرے کو تکنے لگے۔ چند لمحے گزرے تھے کہ ایک شخص دوڑتا ہوا آیا اور کہنے لگا کہ مدینے میں فلاں مشہور منافق کو ابھی موت نے آ لیا۔ اس منافق کی عمر ستر سال تھی

بہت سی آیات میں قرآن مجید نے "اخلاص" سے بننے والے اسم صفت بھی استعمال کیے ہیں مثلاً "مُخلِص" اور "مُخلَص"۔ اول الذکر کا مطلب ہے "خلوص والا" "وہ جسے (اللہ کی طرف سے) خلوص عطا ہوا ہو۔ گیارہ مقامات پر مخلص کا لفظ آیا ہے ان میں سے دس جگہ اس صفت کا تعلق دین سے ہے جیسا کہ آپ مذکورہ بالا آیت میں دیکھیں۔ ساتھ ہی اس لفظ کا رشتہ عبادت سے بھی قائم ہوتا ہے۔

إِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللَّهَ مُخْلِصًا لَهُ

الدِّيْنَ (۳۹: ۲)

بے شک ہم نے یہ کتاب تمہاری طرف حق کے ساتھ اتاری ہے تو اللہ کی بندگی کرو دین کو اسی کے لیے خالص کرتے ہوئے۔

ہیں ہمیں یہ بھی سمجھا رہا ہے کہ اس بندگی میں اور کیا کچھ مضمر ہے۔ اس کا مطلب ہے صرف اور صرف اللہ کی کامل عبادت اور صرف اسی سے پوری طرح لو لگانا اور اپنے ایمان و عمل کو صرف اسی ذات واحد پر مرکوز کر دینا، یوں کہ بتوں اور دوسروں کی پرستش کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔

خلاصہ یہ کہ "اخلاص" دراصل انسان میں "توحید" کی تجسیم کا نام ہے۔ اسی سے اس بات کی توجیہ ہوتی ہے کہ قرآن مجید کی سورت ۱۱۲ کو "سورۂ اخلاص" بھی کہا جاتا ہے اور "سورۂ توحید" بھی اسی کا نام ہے۔ جب توحید انسان کی پوری زندگی پر چھا جاتی ہے اور وہ توحید پر پوری طرح عمل پیرا ہوتا ہے تو وہ "مخلِص" اور "مخلَص" ہوتا ہے۔ وہ اپنے دین کو صرف اور صرف اللہ کے لیے خالص کر لیتا ہے اور اس کے انعام میں اللہ تعالیٰ اس کو اپنے سوا ہر شے سے، ماسوی اللہ سے، رشتہ جوڑنے اور اس پر توجہ دینے کی آلائش سے پاک کر دیتا ہے

تقویٰ God- wariness

"احسان" کا ایک قریب ہم معنی لفظ اور بھی ہے اور غالباً سب سے اہم لفظ ہے یعنی "تقویٰ"۔ اس کا ترجمہ انگریزی میں God wariness کے الفاظ سے کیا گیا ہے۔ قرآن کے مترجمین نے اس لفظ کے بہت سے مترادف استعمال کیے ہیں مثلاً dutifulness, piety righteousness good conduct, God conciousness, Godfearing, guarding against evil

اہلِ تقویٰ یا متقی انسان کا ذکر قرآن میں جتنی بار آیا ہے وہ اہلِ اخلاص اور

اصل حسن سے کہیں زیادہ ہے۔ تقویٰ کے معنی ہیں "بچاؤ کرنا، حفاظت کرنا، بچنا، احتیاط کرنا، نگہداشت کرنا، کسی چیز سے ڈرنا، گھبرانا"۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ ایک ایسا انسانی رویہ ہے جو ہر انسانی خوبی کا نچوڑ ہے اور قرآن کے بیان کے مطابق اس خیر و خوبی کا ہدف و مرکز اللہ تعالیٰ کو ہونا چاہیے۔ آیت ہے کہ

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ (٤٩.١٣)

خدا کے نزدیک تم میں سے سب سے زیادہ شرف والا وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیز گار ہے۔

قرآن مجید میں بار بار انسانوں کے لیے "تقویٰ" کا حکم آیا ہے۔ عام طور پر ان آیات میں فعل اس طرح استعمال ہوا ہے کہ اسم مفعول خود ذات خداوندی قرار پاتی ہے۔ اس صورت میں اس کا ترجمہ یوں ہو گا "be wary of God"۔ دیگر مترجمین نے اس کا ترجمہ "be dutiful toward God"، be concious of God، Pious toward God، be God fearing وغیرہ کے الفاظ سے کیا ہے۔ لفظ کے مضمرات یہ ہیں کہ اگر انسان ہمیشہ اللہ کی طرف متوجہ رہے تو وہ بچا بچا یا بہت سی چیزوں سے ڈرتا رہتا ہے۔ بالفاظ دیگر آپ جب بھی کچھ کہیں یا کریں تو یوں کریں گویا "کہ آپ خدا کو دیکھ رہے ہیں"۔ یہاں آپ کو بہت محتاط رہنا چاہیے کیونکہ معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ صرف ہمارے عمل ہی کو نہیں دیکھتا، ہماری سوچ بھی اس پر عیاں ہے۔

وَإِن تُحْسِنُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا

(٤.١٢٨)

اور اگر تم حسن سلوک سے پیش آؤ گے اور تقویٰ اختیار کرو گے تو جو کچھ کرو گے اللہ اس

بِكُمْ عَنْكُمْ تَتَّقُونَ (۲ ۱ ۲)

[illegible]

"تقویٰ" کی جو تصویر قرآن مجید سے ہویدا ہوتی ہے وہ تنزیہ و تشبیہ کے درمیان پائے جانے والے تعلق کی ایک واضح مثال ہے۔ "تقویٰ" اللہ تعالیٰ کے غضب و عذاب سے بچنے پر مرکوز ہے سو اس کا تقاضا ہے کہ اللہ اور اس کے بندے کے مابین صحیح تعلق، رعایا اور شہنشاہِ کائنات کے درمیان رابطے کی صحیح صورت کو مثالی انداز میں پیش نظر رکھے۔ انسان کو جس خدا سے بچنا اور ڈرنا چاہیے وہ خداوند پُرجلال و قہار ہے، وہ خدا جو اس سے دور کہیں ہے اور اس بات کا سزاوار ہے کہ اس کی ہیبت اور خوف انسان کو لرزا دے۔

انسان ایک مرتبہ "تنزیہ" کا رشتۂ تعلق استوار کر لے تو یہ نہیں ہوتا کہ وہ اللہ سے دوری میں پڑا رہتا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ اسے اپنے قرب میں لے آتے ہیں۔ اس کی رحمت، مہربانی اور جمال اپنے بندوں کی عاجزی اور فروتنی کے جواب میں انہیں سمیٹ کر اپنے حضور میں بلند مراتب عطا کر دیتی ہے۔ اللہ کا قرب ہی انسان کو اس لائق بناتا ہے کہ وہ خود کو شایستہ خلافتِ الٰہی بنا سکے۔

وہ لوگ جو اہلِ تقویٰ میں سے ہیں وہ "رحمٰن" کے قرب سے سرفراز ہوں گے لیکن جو اپنے فرائض انجام دینے میں ناکام رہے ہوں گے وہ "قہار" کے غضب کی پکڑ میں آ جائیں گے۔

يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِينَ إِلَى الرَّحْمَٰنِ وَفْدًا وَنَسُوقُ

نے اس اصطلاح کو کس طرح استعمال کیا ہے۔ خاص طور پر یہ جاننا چاہیے کہ محبت کا اللہ تعالیٰ سے کیا ربط اور تعلق بنتا ہے۔ ایک مرتبہ یہ سمجھ لیا جائے کہ اللہ سے محبت کرنے کا کیا مطلب ہے تو یہ سمجھنا آسان ہو جائے گا کہ انسانی محبت میں کیا کچھ پنہاں ہے۔

لگ بھگ پندرہ آیات ایسی ہیں جن میں قرآن مجید نے ”محبت“ کو اللہ تعالیٰ سے نسبت دی ہے اور ان کے علاوہ اور متعدد آیات ایسی ہیں جو یہ بتاتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو کن چیزوں سے ”محبت نہیں ہے“۔ انسانی محبت کو اللہ تعالیٰ کے حوالے سے اگر کوئی معنویت مل سکتی ہے تو فقط اس طرح کہ وہ حب الٰہی کی مثال کی پیروی کرے۔

ایک حدیث ہے جو ہم پہلے بھی درج کر چکے ہیں۔ اس پر غور کیجیے تو تصور محبت کو اس سیاق و سباق میں رکھا جا سکتا ہے جس میں صدیوں روایت نے اسے دیکھا اور سمجھا۔ رسول خداؐ نے فرمایا ”اللہ جمیلٌ و یحب الجمال“۔ ہمارے زمانے میں تو ہمیشہ یہی کہا گیا کہ محبت کا ہدف صرف ایک صاحب جمال اور حسین چیز ہی ہو سکتی ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ محبت کے بارے میں اس نقطہ نظر کو قرآن سے الگ سمجھا جائے۔ عربی کی لغات یہ بتاتی ہیں کہ عملاً ”جمال“ اور ”حسن“ دونوں مترادف ہیں۔ ”احسان“ کا مطلب ہے حسن عمل۔ قرآن میں چودہ مقامات پر ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی شے سے محبت کرتے ہیں۔ ان میں سے پانچ مقامات پر محبت ان لوگوں کے لیے مذکور ہے جو اہل ”احسان“ ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ ان سے محبت کرتے ہیں تو صرف اس لیے کہ حسن عمل سے خود ان میں اخلاق حسنہ اور اوصاف حمیدہ پیدا ہو گئے ہیں اور ان کی وجہ سے وہ اللہ کی محبت کے لائق شمار ہوتے ہیں۔

قرآن میں جہاں کہیں بھی یہ ذکر آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی شے سے محبت کرتے

[illegible] صورتیں ان الفاظ میں بیان ہوئی ہیں۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ذَٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاللَّهُ عِندَهُ حُسْنُ الْمَآبِ (۱۴:۳)

لوگوں کی نگاہوں میں مرغوبات یعنی عورتیں، بیٹے، سونے چاندی کے خزانے، نشان زدہ گھوڑے، مویشی اور کھیتی خوشنما بنا دی گئی ہیں۔ یہ دنیوی زندگی کے سروسامان ہیں اور اللہ کے پاس اچھا ٹھکانا ہے۔

یہ تو شاید ہو مگر انسان کو اس حسن تزئین سے دل نہیں لگانا چاہیے جس کی کشش ان کی خواہشات کو کھینچتی رہتی ہے بلکہ اس کی محبت کا ہدف اور مرکز اللہ تعالیٰ کا جمال اور جلال ہونا چاہیے۔ نوع انسانی کے ہر روگ کا علاج اسی میں ہے کہ اس کی محبت کا رخ اس کے اصل مرکز اور اس کے سچے ہدف کی طرف پھر سے موڑ دیا جائے۔

یہاں آ کر ہمیں ایک مرتبہ پھر نبوت کی بنیادی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہوگا۔ انسان ایک ایسے خدا سے کیونکر محبت کر سکتا ہے جسے وہ جانتا ہی نہیں۔ اور پھر جب ایک مرتبہ اس نے یہ جان لیا کہ اللہ تعالیٰ ہی چاہے جانے کے قابل ہے تو پھر اسے اب کیا کرنا ہے؟ قرآن کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ایک مرتبہ جب یہ شعور پھوٹ پڑے تو راستہ کھلا ہوا ہے۔ اب اس شخص کو رسول خدا کی سنت کی پیروی کرنا ہے۔ اسی صورت میں انسان عمل صحیح، ایمان صالح اور ''احسان'' کے وسیلے اللہ کی طرف بڑھ سکتا ہے۔ صرف عمل ہی میں نہیں بلکہ اخلاق و کردار میں بھی رسول خدا کا اتباع

شرعی قانون کی حدود میں کس حد تک آتا ہے، جس حد تک اس کا تعلق اللہ تعالیٰ کے روبرو ذمہ داری اور رسول خداؐ کے اتباع سے ہے۔

''ایمان'' سے فہم کی جہت کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ ''ایمان'' سے انسان یہ سمجھ لیتا ہے کہ عمل کے معنی اس کی روزمرہ زندگی سے اور ایک عالم سے پیوستہ ہیں اور اس کا رشتہ حقیقت ربانی تک پہنچتا ہے۔ ''ایمان'' ہی انسان کو یہ فہم عطا کرتا ہے کہ کائنات کی ہر شے پر ''توحید'' کا عمل جاری ہے تاہم انسان کی آزادی اختیار اس توازن کو درہم برہم کر سکتی ہے۔ اسی سے یہ پتا چلتا ہے کہ اللہ کا بندہ بننا کیوں ضروری ہے۔ اور اسی سے اس پر یہ واضح ہوتا ہے کہ اللہ کا خلیفہ بننے کے لیے اسے کون سی راہ کا انتخاب کرنا ہوگا۔ ''ایمان'' سے ہر بات عیاں ہو جاتی ہے۔ انسانی عمل کا تار و پود حق سے کیسے گہرے تعلق میں بندھا ہوا ہے اور مرنے کے بعد اس کے نتائج دائمی ہو جائیں گے۔

''احسان'' کی آمد سے ''اسلام'' اور ''ایمان'' میں ایک اور اضافہ ہوتا ہے۔ اب ان دونوں کا مرکز حسن نیت بن جاتا ہے۔ ''احسان'' سے انسان کو یہ تلقین ہوتی ہے کہ اس کے حسن عمل، اس کے ارادہ و کاوش کا رخ اس آگہی کی بنیاد پر متعین ہونا چاہیے کہ ہر شے اللہ کی ہے اور اللہ تعالیٰ حاضر و ناظر اور ہر جا موجود ہے۔

قرآن مجید اور اسلامی روایت میں بسا اوقات ان تینوں جہات کو الگ الگ کر کے دیکھا گیا ہے یعنی ''اسلام''، ''ایمان'' اور ''احسان''، اور بعض اوقات ان میں یہ تمیز قائم نہیں رکھی گئی۔ قرآن مجید تو خاص طور پر کئی ایسے الفاظ میں کلام کرتا ہے جن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں اسلام کی دونوں یا تینوں جہات پر بیک وقت زور دیا جا رہا ہے۔ سو ہمارے لیے ان اصطلاحات میں سے ایک پر غور کرنا مفید

رہے گا تا کہ یہ دیکھا جا سکے کہ "عمل صالح" کا اسلامی تصور قرآن میں جس طرح بیان ہوا ہے اس کا اسلام کی تیسری جہت سے بہت گہرا تعلق ہے کہ دونوں کو الگ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ گفتگو خواہ اسلام کی پہلی جہت پر کیوں نہ ہو رہی ہو اس پہلو کو آپ کسی صورت بحث سے جدا نہیں کر سکتے۔ اس ضمن میں جو اصطلاح ہمارے پیش نظر ہے وہ ہے "صالح"۔ اس لفظ کے بنیادی معنی ہیں "سالم ہونا، ٹھیک ہونا، درست، شائستہ، بھلا اور موزوں ہونا" انگریزی میں اس لفظ کے ترجمے کے لیے ہم نے ہمیشہ Wholesome کا لفظ برتا ہے اس سے ہمارا مقصد یہ تھا کہ انگریزی مترادف ایسا ہو جسے انسانوں کے لیے اور انسانی عمل کے لیے یکساں طور پر استعمال کیا جا سکے۔ کیونکہ قرآن مجید میں لفظ کے دونوں مفاہیم آئے ہیں، "صالحات" (نیک عمل، اچھے کام، wholesome deeds) اور "صالحون" (اچھے، نیک لوگ)۔

قرآن مجید کے مطابق "ایمان" کے ساتھ عمل صالح جنت کا حقدار بناتا ہے۔ درج ذیل آیات میں سے پہلی آیت میں جو الفاظ آئے ہیں

لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۱۰:۶۲)

بے شک اللہ کے دوستوں کے لیے نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

یہی الفاظ ہیں جو صالح دوست لوگوں کے لیے آتے گئے تھے یہ بھی ملاحظہ کیجیے کہ بعض آیات میں "صالح" اور "جمیل" ہم معنی الفاظ کے طور پر آئے ہیں

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَىٰ وَالصَّابِئِينَ مَنْ

آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ

اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے ہم ان کو صالحین کے

زمرہ میں داخل کریں گے

سامنے کی بات ہے کہ ''صلاح'' کا تعلق رحمتِ خداوندی سے ہے۔ صلاح رحمت ہی سے برآمد ہوتی ہے کیونکہ اس کا نتیجہ ہے اللہ کا قرب (دیکھیے آیات ۲۱:۷۵، ۲۱:۸۶، ۲۷:۱۹) یہاں ایک نکتہ یہ بھی توجہ طلب ہے کہ وہ تین آیات جن میں سیدنا ابراہیمؑ کے صالحین میں سے ہونے کا ذکر آیا ہے ان میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ''فی الآخرۃ'' (اگلے جہان میں) سیدنا ابراہیمؑ تمام انسانی کا نمونہ ہیں، فطرتِ انسانی کی تجسیم ہو توحیدی دین کے جد امجد ہیں، وہ پیغمبر جن کو اپنے اخلاق و اوصاف میں سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے قریب ترین سمجھا جاتا ہے۔ یہاں جو نکتہ مضمر ہے وہ یہ ہے کہ وہ تمام ''مسلم'' جو فطرتِ انسانی کو کامل حاصل کر لیتے ہیں وہ اگلے جہان میں صالحین میں سے ہوں گے نیز یہ کہ صلاح یا wholesomeness ایک ایسی صفت ہے جو زیادہ تر اگلے جہان ہی میں پائی جائے گی۔ عمل صالح کرنے کا مطلب بہر طور یہی تو ہے کہ اپنے ہر کام اور ہر عمل کو ''واحد'' سے جوڑ دیا جائے، یعنی توحید قائم کی جائے۔ اس کے پورے امکانات اور مکمل نتائج و ثمرات اس وقت تک انسان کے سامنے نہیں آتے جب تک موت اس کی نگاہ کے پردے ہٹا نہیں دیتی۔

خلاصہ یہ کہ جہاں جہاں قرآن مجید نے ''عمل صالح'' یا ''صالحات'' کی اصطلاح استعمال کی ہے وہاں صرف اتنا نہیں کہا کہ یہ عمل صحیح اور درست ہے بلکہ یہ کہ یہ کام ٹھیک نیت سے کیا گیا ہے۔ منافق لوگ نیک کام بظاہر تو ٹھیک طرح ہی کرتے ہیں لیکن اس کی پاداش میں وہ جہنم کے سب سے گہرے گڑھے میں

پھینکا جائے گا۔

قرآن مجید نے اسی مادے اور اسی بنیادی مفہوم سے بنے ہوئے کئی اور الفاظ بھی استعمال کیے ہیں جو خاصے اہم ہیں اور اگر اسلامی شعور کے لیے "اصلاح" کے تصور کی معنویت کو پوری طرح جاننا ہو تو ان پر نظر ڈالنا مفید رہے گا۔ مثال کے طور پر "اصلاح" کا لفظ کئی مقامات پر استعمال ہوا ہے۔ یہاں اس کے معنی ہیں 'صلاح قائم کرنا، صلاح کو استوار کرنا'۔ فی زمانہ اس لفظ اصلاح کو انگریزی reform کے مفہوم میں برتا گیا ہے۔ اسی طرح "صلح" کا لفظ ایک آیت میں اس ہم آہنگی اور سکون و آشتی کے معنی میں آیا ہے جو جھگڑے میں میاں بیوی کے مابین ہونا چاہیے۔ بعد میں یہ لفظ صلح و جنگ کے سیاسی معنی میں استعمال ہونے لگا۔

قرآن میں "صالح" کے لفظ کے دیگر مفاہیم و مضمرات کو سمجھنا ہو تو یہ دیکھنا چاہیے کہ قرآن مجید نے اس کے متضاد لفظ یعنی 'فاسد' کو کیونکر استعمال کیا ہے۔ "فاسد" کا مطلب ہے 'غلط، برا، خراب و برباد اور بگڑا ہوا'۔ "صالح" وہ ہے جو خلق سے ہم آہنگی کی زندگی گزارے اور اپنے عمل کو "صالح" اور راستکاری کی بنا پر استوار اور قائم رکھے۔ اس کے برعکس "مفسدین" workers of corruption (فسادی، فساد کرنے والے) وہ لوگ ہیں جو اشیاء کے مابین درست رشتوں کو درہم برہم کر کے تباہ کر ڈالتے ہیں۔

"فساد" اور "توحید" یعنی خدا کی یکتائی کے درمیان جو تعلق ہے اس کو قرآن مجید نے صریح الفاظ میں بیان کیا ہے۔ سب سے پہلے تو قرآن نے اس بات پر زور دیا ہے کہ کائنات کا صلاح و نظام اس کے ایک اصول واحد پر مبنی ہونے کی وجہ سے ہے۔ اگر حقیقت کا ماخذ ایک سے زیادہ ہوا کرتا تو یہ کائنات پارہ پارہ ہو کر منتشر ہو

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ

لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ (روم ۳۰ : ۴۱)

خشکی اور تری میں فساد لوگوں کے ہاتھوں کے نتیجے میں پیدا ہو چکا ہے۔

اللہ ان کو ان کی کرتوتوں کا مزہ چکھانے کا ارادہ رکھتا ہے۔

جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کے نتیجے میں فساد کیوں جنم لیتا ہے؟ اسلام کے نقطۂ نظر سے سمجھنا مشکل نہیں ہے۔ یہ مسلّمہ بات ہے کہ اکثر جدیدیت پسند مسلمانوں نے سائنس اور ٹیکنالوجی کو اپنی آغوشِ توجہ میں سمیٹ کر اپنا لیا ہے اور اس کی قدر و قیمت بلا چون و چرا تسلیم کر لی ہے۔ ذرا غور کیجیے کہ جدید سائنس کے ہاتھوں اور ٹیکنالوجی کی ترقی و پیشرفت کے علمبرداروں کا بنیادی دعویٰ کیا ہے؟ خود ان کی نظر میں سائنس کا ہدف اور مقصد کیا ہے۔ ہم سب نے بارہا یہ سنا ہے کہ مغربِ جدید نے آخرکار عالمِ طبعی کی تسخیر میں کامیابی حاصل کر لی ہے اور اسی سے دیگر تمام تہذیبوں پر فوقیت اور برتری حاصل ہو گئی ہے۔ اس طرح کے بیانات کی تہ میں ایک مفروضہ کام کر رہا ہے اور وہ یہ کہ ہمیں بحیثیت انسان یہ حق حاصل ہے کہ کائنات کے ساتھ، اس عالمِ طبعی کے ساتھ جو چاہیں کریں۔ دوسری طرف اسلام کی نگاہ میں عالمِ طبعی یا بقول گنوں "قدرت" وہ دائرہ ہے جس میں اللہ کی نشانیاں ظہور کرتی ہیں۔ انسان کی ہر وہ کوشش جو ان کے وقوع پذیر ہونے کے فطری نظم کو تلپٹ کر دے ایک ایسا عمل قرار پائے گی جو کارخانۂ تخلیق میں اللہ کی مشیت سے سرتابی کے مترادف ہو گا۔ انسان کے لیے عالمِ طبعی کو مسخر کرنے کی سعی ایسی ہی ہے کہ گویا اس نے مشیت خداوندی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہو اور اللہ تعالیٰ نے اسے جس صورتحال میں پیدا کیا ہے اس کی ناشکری کرنے لگا ہو اور یہ دعویٰ کرنے چلا ہو کہ اس کارخانہ

قدرت میں اللہ تعالیٰ کی وہ حکمت موجود نہیں ہے۔ یہاں عالم طبعی یا Nature سے ہماری مراد صرف شہر سے باہر کے قدرتی مناظر ہی نہیں ہیں۔ یہ سارا عالم مشہود، دکھائی دینے والی ساری کائنات Nature ہے، اس میں معاشرہ اور انسانی افراد سب شامل ہیں۔

فطری بات ہے کہ اس جگہ پر لوگوں کی طرف سے یہ آواز احتجاج بلند ہوگی کہ انسان کو جو صلاحیتیں دی گئی ہیں وہ بھی تو فطرت کا حصہ ہیں۔ تسخیر فطرت کی قوت بھی تو ہمیں اللہ ہی کی طرف سے عطا ہوئی ہے تاکہ ہم معاشرے کو بہتر بنا سکیں تو پھر ہم اس کا استعمال کیونکر نہ کریں؟ آخر ہم ساری اذیت کو خاموشی سے کیوں برداشت کریں؟ اسلام کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس قوت کو استعمال کی حدود مقرر کر دی ہیں کیونکہ یہ قوت انسان کے خلیفۃ اللہ ہونے کے خارجی ظہور سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے۔ انسان کو اس معاملے میں من مانی کرنے کے لیے آزاد نہیں چھوڑ گیا بلکہ یوں کہیے کہ وہ چاہے تو اس آزادی کو استعمال کر سکتا ہے لیکن پھر اس کو اپنے عمل کا نتیجہ بھگتنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ عالم مخلوقات پر "اسلام کائناتی" کی حکمرانی ہے اور مذہب کی شکل میں انبیاء کے اسلام کی جلوہ گری ہے۔ اگر انسان کا عمل ان دونوں سے ٹکرا جائے گا تو پھر اس کے لیے خسارہ ہی خسارہ ہے، یہاں بھی تباہی اور اگلے جہان میں بھی خرابی۔

سوال یہ ہے کہ پھر انسانی معاشرے کے مسائل کا حل کیا ہے؟ بھوک، بیماری، جور و ستم، کثافت، آلودگی اور انسان کی پیدا کردہ ہزاروں دوسری مصیبتوں کا مداوا کیونکر ممکن ہے؟ قرآن کے نقطہ نظر سے راستہ صرف ایک ہی ہے، دین (یعنی "اسلام"، "ایمان" اور "احسان" کے وسیلے) اللہ کی طرف رجوع۔

سے وہ انسان کو اپنے قریب کر لیتا ہے اور اس کا قرب نام ہے "جنت" (باغ) کا یا "رحمتِ خداوندی" کا۔

وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا وَادْعُوهُ خَوْفًا وَطَمَعًا إِنَّ رَحْمَتَ اللَّهِ قَرِيبٌ مِنَ الْمُحْسِنِينَ (۷:۵۶)

اور ملک میں، اس کی اصلاح کے بعد فساد نہ کرو اور اسی کو پکارو خوف اور طمع، دونوں حالتوں میں۔ بے شک اللہ کی رحمت محسنوں سے قریب ہے۔

خلاصہ یہ کہ "اصلاح" اور "فساد" کے تصورات کے ذریعے قرآن مجید نے عالم خلق میں انسان کے کردار اور حیثیت کی ایک ایسی تصویر کھینچ دی ہے جس میں عمل صحیح اہم ترین اور خالص نیت کو ان کی متعلقہ صفات سے الگ کر کے دیکھا جا سکتا ہے۔ اس میں ہمارے لیے ایک اور مثال ہے کہ اللہ کے دو پہلوؤں کی، اس کی رحمت اور اس کے غضب کی انسانی دنیا میں کیسے کارفرمائی ہوتی ہے، اس زمینی دنیا میں، عالم سفلی میں جہاں انسان کو اللہ کا خلیفہ مقرر کیا گیا ہے۔ اس تصویر میں "اصلاح" کی نسبت رحمت، جنت اور جمال سے ہے جبکہ "فساد" کا تعلق غضب، جہنم اور جلال سے ہے۔

جمال، کمال اور اصلاح تب قائم ہوتے ہیں جب انسان پورے کا پورا حق کا ہو جائے، خلق سے اس کا تعلق مکمل طور پر جڑ جائے۔ صحیح معنی میں "مصلح" وہ ہے یعنی اہل صلاح وہ لوگ ہوتے ہیں جو اللہ کی کامل بندگی بھی کرتے ہیں اور اس کے کامل خلیفہ بھی ہوتے ہیں۔

باب ہشتم

"احسان" کے تاریخی مظاہر

دعا و مناجات

انسان کے نفس میں جھروکے تلاش کرنا یوں بھی کوئی آسان کام نہیں ہے اور پھر معاملہ اگر ایک ایسی تہذیب کا ہو جس میں ذہنی حالت کو قید تحریر میں لانے کی سرے سے جو صد افزوں نہ ہوئی ہو تو معاملہ اور بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ اسلامی ادبیات میں آپ بیتی ایک نسبتاً کمیاب صنف ہے اور اس ضمن میں جو تھوڑی بہت تحریریں نظر آتی ہیں ان میں بھی مصنف کے محرکات اور روحانیت کا تجزیہ شاذ ہی ملتا ہے بالخصوص مذہبی معاملات کے ضمن میں تو یہ چیز بالکل حیطۂ تحریر میں نہیں آتی۔ تاہم اصناف تحریر کے ضمن میں سے ایک صنف ایسی ضرور ہے جس میں لکھنے والے اپنے اندر کو کھول کر رکھ دیتے ہیں، دوسرے انسان کے سامنے نہیں بلکہ اپنے رب کے روبرو۔ یہ صنف ہے "دعا" Supplication، اللہ سے ذاتی درخواست، اللہ کے لیے انسان کی پکار، اس کے حضور مناجات۔ یہ درست ہے کہ دعا کو اگر تحریر محفوظ کر لیا جائے تو اس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ اس کی بے ساختگی میں کمی آ گئی۔ لیکن اس کے باوجود اسلامی دعاؤں کا حرف و آہنگ ہی اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ایک صحیح تعلق قائم کرنے کی سعی کرتے ہوئے مسلمان کو کن معاملات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

احادیث رسول ﷺ کا ایک اہم حصہ اور شعبہ دعائیں بھی رہی ہیں۔ رسول خدا ﷺ کی

ذاتی دعاؤں میں سے بہت سی دعائیں یاد کی جاتی تھیں اور ان کو لکھ بھی لیا گیا تھا۔ پھر بہت سے موقعوں پر ایسا ہوا کہ آپؐ نے دوسروں کو دعا کی تعلیم دی، یہ سکھایا کہ اللہ کو پکارنے کا سلیقہ قرینہ کیا ہوتا ہے۔ بسا اوقات لوگوں نے آپؐ کو ایک ہی دعا کئی مرتبہ پڑھتے ہوئے سنا اور اس طرح وہ دعا لوگوں کے حافظے میں نقش ہو گئی۔ آپؐ کے خاندان میں سے کئی اصحاب نے دعاؤں کے مجموعے یادگار چھوڑے ہیں جن میں آپؐ کے پڑپوتے حضرت علی بن حسینؓ خاص طور پر قابل ذکر ہیں ان کی تصنیف ''الصحیفۃ السجادیہ'' کو دعاؤں کی صنف کی امہات الکتب میں شمار کیا جاتا ہے۔ اسلام کے ابتدائی عہد میں لوگوں کے تعلق باللہ کی کیا صورت تھی اور انسان اور اس کے رب کے شخصی، ذاتی تعلق کی نوعیت کیسی تھی، یہ اگر جاننا ہو تو کوئی اور چیز اس مجموعے سے حاصل ہونے والی بصیرت کی ہمسری نہیں کر سکتی۔

رسول خداؐ اور دوسرے عظیم مسلمانوں سے منقول دعاؤں کا پڑھنا مسلمانوں کے لیے اپنے اسلاف کا اتباع کرنے کا ایک راستہ ہے جس سے وہ یہ سیکھتے اور جانتے ہیں کہ اللہ سے ہم کلام ہونے، اسے پکارنے کا طریقہ کیا ہے اور اللہ کے روبرو انسان کا صحیح رویہ کیا ہونا چاہیے۔ علاوہ ازیں انہیں ان دعاؤں کو دہرا کر یہ طمانیت بھی ہوتی ہے کہ وہ دعا کی تلقین کرنے والی شخصیت سے ایک ذاتی قربت پیدا کر رہے ہیں۔

مسلمانوں کی دعاؤں کو پڑھیے تو پہلا احساس یہ ہوتا ہے کہ ان میں مجرد اصطلاحی زبان اور تجزیہ کا تناظر سرے سے ناموجود ہے جبکہ مسلمانوں کی ابتدائی کلامی تحریروں میں یہ عنصر خاص طور پر نمایاں ہوتے تھے۔ یہاں خدا ایک دور دراز بادشاہ وقت نہیں ہے جو صرف اپنے غلاموں کے لیے احکامات صادر کرتا ہو اور

ان سے حکم بجا لانے کی، طاعت کی توقع رکھتا ہو۔ اس کے برعکس ان دعاؤں کا خدا عبادت کرنے والے کے پاس ہے، اس کی دعا سنتا ہے اور اس کا جواب دیتا ہے۔ کیا قرآن میں یوں نہیں آیا ہے ادعونی استجب لکم۔ مختصر یہ کہ دعاؤں کا خدا وہ ہے جسے تشبیہ کے نقطہ نظر سے دیکھا گیا ہے۔ یہ وہ خدا ہے جس سے انسان انس و محبت کا رشتہ جوڑ سکتا ہے۔ وہ خدا جس کا انسانی زندگی کی ہر چھوٹی بڑی چیز سے ناطہ ہے۔ انسان کے پاس دو الگ الگ میدان نہیں ہوتے، ایک وہ دائرہ جس کی غیر اہم چیزوں سے اللہ کو کوئی سروکار نہیں اور دوسرا وہ جو اللہ کے معاملات پر مشتمل ہو یہ نہیں ہے۔ توحید کا تقاضا ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کے ہر معاملے سے ایک تعلق رکھتا ہے۔ رسول خدا نے فرمایا تھا کہ

تم میں سے ہر شخص کو چاہیے کہ اپنی ہر حاجت کے لیے اللہ کو پکارے۔ تمہاری جوتی کا تسمہ بھی اگر ٹوٹ جائے تو اس سے دعا کیا کرو۔

جدید اسلام نے بہت سی شکلوں میں جنم لیا ہے۔ اللہ سے ذاتی تعلق کی جو ایک گہرائی تھی اور جسے قرآن اور اسلامی روایت نے پسندیدہ بات بتایا تھا اسے پس منظر میں دھکیل دیا گیا۔ ایسا ہونا بالکل فطری تھا کیونکہ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ جدیدیت زدہ اسلام میں اسلامی تعلیمات کے عقلی پہلو پر زور دیا جاتا ہے کچھ اس لیے کہ اس عذر خواہی سے اسلام پر ہونے والی مغربی تنقید کا دفاع ہو جائے اور کچھ اس لیے بھی کہ اس سے مذہبی فکر کا ایک ایسا اصول بن سکے جس کے سہارے سائنس اور علوم کی جدید شکلیں، بالخصوص ٹیکنالوجی، اسلامی ممالک میں نفوذ پا سکیں۔ یہ بات ہمیشہ مدنظر رہنی چاہیے کہ مذہبی فکر کا عقلیت پسند رویہ ہمیشہ اپنی فطرت کے اعتبار سے ہی تجرید پر زور دیا کرتا ہے اور اسی لیے اس میں حقیقت خداوندی کے غیر شخصی

اور جدید پہلوؤں پر توجہ اور رب کا ذکر نمایاں رہتا ہے۔ یوں یہ دعا آج بھی مسلمانوں کی مذہبی زندگی میں ایک بڑا کردار ادا کرتی ہے خاص طور پر ان لوگوں میں جن کے ہاں بھی جدید تعلیم نے آ کر روایتی تصورِ کائنات کو تبدیل نہیں کیا۔ دعا کے جو ڈیلین نمونے مسلمانوں کے سامنے رہتے ہیں اس کے مطابق دعا آج بھی ایک بالکل ذاتی چیز گردانی جاتی ہے جس سے انسان یہ دیکھنے کے قابل ہو جاتا ہے کہ اس کی زندگی کا ہر پہلو، ہر گوشہ کس طرح اللہ تعالیٰ سے ایک قریبی اور ذاتی رشتے میں ڈھلا اور بندھا ہوا ہے۔ مثال کے طور پر درج ذیل دعا پر غور کیجیے جسے ہم نے حضرت علی بن حسین کی کتاب "الصحیفۃ الکاملۃ السجادیۃ" سے نمونے کے طور پر منتخب کیا ہے۔ اس کا عنوان ہے "خشک سالی کے دوران بارش کی دعا" (دعا عدد ۱ استسقی بعد الجدب)۸

اللَّهُمَّ اسْقِنَا الْغَيْثَ، وَانْشُرْ عَلَيْنَا رَحْمَتَكَ بِغَيْثِكَ الْمُغْدِقِ مِنَ السَّحَابِ الْمُنْسَاقِ لِنَبَاتِ أَرْضِكَ الْمُونِقِ فِي جَمِيعِ الْآفَاقِ، وَامْنُنْ عَلَى عِبَادِكَ بِإِينَاعِ الثَّمَرَةِ، وَأَحْيِ بِلَادَكَ بِبُلُوغِ الزَّهَرَةِ، وَأَشْهِدْ مَلَائِكَتَكَ الْكِرَامَ السَّفَرَةَ بِسَقْيٍ مِنْكَ نَافِعٍ، دَائِمٍ غُزْرُهُ، وَاسِعٍ دِرَرُهُ، وَابِلٍ سَرِيعٍ عَاجِلٍ، تُحْيِي بِهِ مَا قَدْ فَاتَ، وَتُخْرِجُ بِهِ مَا هُوَ آتٍ، وَتُوَسِّعُ بِهِ فِي الْأَقْوَاتِ، سَحَاباً مُتَرَاكِماً هَنِيئاً مَرِيئاً طَبَقاً مُجَلْجَلاً، غَيْرَ مُلِثٍّ وَدْقُهُ، وَلَا خُلَّبٍ بَرْقُهُ. اللَّهُمَّ اسْقِنَا غَيْثاً مُغِيثاً مَرِيعاً مُمْرِعاً عَرِيضاً وَاسِعاً غَزِيراً، تَرُدُّ بِهِ النَّهِيضَ وَتَجْبُرُ بِهِ الْمَهِيضَ. اللَّهُمَّ اسْقِنَا سَقْياً تُسِيلُ مِنْهُ الظِّرَابَ

وَتَمْلَأُ مِنْهُ الْجِبَابَ، وَتُفَجِّرُ بِهِ الْأَنْهَارَ، وَتُنْبِتُ بِهِ الْأَ

شْجَارَ، وَتُرْخِصُ بِهِ الْأَسْعَارَ فِي جَمِيعِ الْأَمْصَارِ، وَتَنْعَشُ

بِهِ الْبَهَائِمَ وَالْخَلْقَ، وَتُكْمِلُ لَنَا بِهِ طَيِّبَاتِ الرِّزْقِ، وَتُنْبِتُ

لَنَا بِهِ الزَّرْعَ، وَتُدِرُّ بِهِ الضَّرْعَ، وَتَزِيدُنَا بِهِ قُوَّةً إِلَىٰ قُوَّتِنَا.

اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلْ ظِلَّهُ عَلَيْنَا سَمُوماً، وَلَا تَجْعَلْ بَرْدَهُ عَلَيْنَا

حُسُوماً، وَلَا تَجْعَلْ صَوْبَهُ عَلَيْنَا رُجُوماً، وَلَا تَجْعَلْ مَاءَهُ

عَلَيْنَا أُجَاجاً. اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلَىٰ مُحَمَّدٍ وَآلِ مُحَمَّدٍ،

وَارْزُقْنَا مِنْ بَرَكَاتِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ، إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ

شَيْءٍ قَدِيرٌ

ترجمہ

الٰہی! ہمیں بارش سے سیراب کر دے، اپنی رحمت ہم پر پھیلا دے موسلا دھار بارش
کے ذریعے جو ہانکے ہوئے بادلوں سے برس رہی ہو کہ تیری یہ مونی دھرتی
سب اطراف میں جھومنے پھولنے لگے۔ اپنے بندوں پر مہربانی فرما کہ پھلوں میں رس
بھر جائے۔ اپنی زمین کو پھر سے زندہ کر دے کہ پھول پھر سے کھل اٹھیں، اور اپنے
فرشتوں، عمل کے لکھنے والے مکرم ہستیوں کو اس کا شاہد بنا دے۔ ایسی سیرابی
کا جس کا فائدہ دائمی، جس کا بہاؤ وافر بھرپور، تیز اور فوراً آنے والا ہو۔ ایسی سیرابی
کہ مردہ ہوئی ہوئی چیز پھر سے جی اٹھے اور ہر آنے والی شے ظاہر ہو جائے، تیری
عطا سے رزق وسیع تر ہو سکے، ان بادلوں کے ذریعے جو تہ بہ تہ، بارش کے پانی سے
لدے ہوئے ہوں، جیسے سیراب کرنے والے، خوشگوار، پھیلے ہوئے بادل ان سے

قاری کے سامنے پیش کی گئی ہیں۔ اپنے موضوعِ گفتگو کی رعایت سے ہم ان میں سے صرف چند پہلوؤں کا لحاظ رکھیں گے اور اس بات کی طرف اشارہ کریں گے جن کی وجہ سے اسلامی تہذیب میں مختلف فنی جہتوں کی مخصوص نشوونما وقوع پذیر ہوئی۔ نیز یہ بھی دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ اسلام کی تین جہات کے تناظر میں اس نشوونما و ارتقا کی معنویت کیا ہے۔9

اسلامی فن کے بنیادی خدوخال خود کلامِ خداوندی یعنی قرآن مجید میں مضمر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اسلامی معاشرے پر اپنے آپ کو کلام کے وسیلے سے ظاہر کیا ہے۔ کلامِ خدا کی حفاظت کے لیے اور اسے اپنے اندر مستور رکھنے کے لیے مسلمان کے تین بنیادی فرائض ہیں: قرآن کی تلاوت، قرآن کی کتابت اور نماز و دیگر عبادات کے ذریعے قرآن کو جزوِ ہستی بنانا، اس کی تجسیم کرنا۔

ہم عرض کر چکے کہ "اللہ جمیل و یحب الجمال" اور یہ بھی کہ "اللہ یحب المحسنین" (اللہ تعالیٰ احسان والوں کو پسند کرتے ہیں)۔ مسلمانوں میں جو احساسِ جمال ہے اس کے وسیلے انہوں نے چاہا کہ ہر شے کو خوبصورتی سے انجام دیں۔ تلاوتِ قرآن نے صوت و آہنگ سے متعلق فنون کو جنم دیا۔ قرآن کی تحریری نقول تیار کرنے یعنی کتابتِ قرآن نے قلم کے ہنر کا آغاز کیا اور قرآن کو مجسم کرنے کی ضرورت سے اسلامی عبادت گاہوں کے ماحول کی تشکیل ہوئی۔ اسی بات کو کھول کر کہیے تو یوں کہا جائے گا کہ اسلام کے تین بنیادی فنون ہیں: قرأت و تجوید و شاعری، خطاطی اور فنِ تعمیر

ہم نے پہلے عرض کیا تھا کہ قرآن مجید صرف پڑھا نہیں جاتا اس کی تلاوت کی جاتی ہے۔ حسنِ آواز ایک بڑی چیز سمجھی جاتی ہے، ایک قابلِ قدر شے۔ کیونکہ ہر شخص

یہ جانا جاتا ہے کہ قرآن مجید کو جتنے خوبصورت انداز میں پڑھا جائے گا اتنا ہی سننے والے کے لیے اس کی تاثیر اور ہیبت میں اضافہ ہوگا، اسی قدر اس سے حظ اٹھایا جائے گا اور اس کے پیغام کی قبولیت بڑھ جائے گی۔ اکثر لوگوں کو بہت کم عمری ہی میں قرآن مجید کا کچھ نہ کچھ حصہ یاد کروا دیا گیا ہوتا ہے۔ بچے قرآنی مکتب میں جاتے تھے جہاں وہ قرآن کی تلاوت سیکھتے تھے (صرف پڑھنا نہیں) اور خطاطی کی تربیت حاصل کرتے تھے (محض تحریر نہیں)

قرآن کا ایک وقار ہوتا ہے جس کا ہر شخص لحاظ رکھتا ہے۔ وہ کتاب جو اللہ کا اپنا کلام ہو اس سے زیادہ احترام کا مستحق ہونا چاہیے۔ اسے زمین پر نہیں رکھا جاتا۔ کتب خانے میں سب سے اوپر کے خانے میں رکھا جاتا ہے، معزز و مکرم جگہ پر۔ مسلمان اگر شرعی طور پر پاک نہ ہو تو اسے قرآن کو چھونے سے گریز کرنا چاہیے۔ اکثر اوقات قرآن کو پڑھنے کے لیے اٹھاتے ہوئے اسے بوسہ دیا جاتا ہے یا آنکھوں سے لگایا جاتا ہے۔ یہی عمل اسے واپس رکھتے ہوئے کیا جاتا ہے۔ تلاوت شروع کرنے سے قبل اعوذ باللہ پڑھی جاتی ہے کہ قرآن مجید کا حکم یہی ہے۔

فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ (۱۶ ۹۸)

جب آپ قرآن پڑھو تو شیطان رجیم سے اللہ کی پناہ مانگ لیا کرو۔

تلاوت کرتے ہوئے تلاوت کے ادب آداب کا خیال رکھا جاتا ہے۔ قرآن مجید فصاحت و بلاغت میں دوسری ہر کتاب سے بڑھ کر ہے۔ چنانچہ اس کی تلاوت کا اسلوب بھی ایسا ہونا چاہیے جس سے اس کا حسنِ بیان اور فصاحت کھل کر سامنے آسکے۔ ہر حرف اور ہر صوت کو صحیح مخرج سے ادا کرنا چاہیے۔ اس لیے بتدریج زمانے

سے قرآن کے قاریوں نے قرآن کی قرأت کے جو خوش آہنگ اور حسین انداز زبانی منتقل کیے ہیں ان کی آج بھی تقلید کی جاتی ہے اور سیکھنے سکھانے پر زور دیا جاتا ہے۔[10]

اگر قرآن کے پڑھنے اور تلاوت کرنے میں نہایت احترام ملحوظ رکھا جاتا ہے تو ساتھ ہی اس کے لکھنے میں بھی ایسا ہی احترام پیش نظر رہتا ہے۔ عربی زبان کی خطاطی نے اگر اسلامی تہذیب کے بنیادی بصری فن کے طور پر نشوونما پائی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کی بنا قرآن پر رکھی گئی ہے اور قرآن کو جس صورت میں پیش کیا جاتا تھا اسے لازماً اس کلام کے متکلم کے جمال و جلال کے مناسب سے ہونا چاہیے تھا۔[11]

اور آخر میں یہ کہ کوئی ایسی عمارت بھی ہونا چاہیے تھی جس میں قرآن کی تلاوت ہوتی، اس کی تعلیم کی جاتی۔ مسجد (سجدہ گاہ، سجدہ کرنے کی جگہ) نے آغاز اسلام ہی سے ایک ادارے کی شکل اختیار کر لی۔ یہ درست ہے کہ کوئی بھی پاک جگہ سجدہ گاہ ہو سکتی ہے اور رسول خدا ﷺ نے فرمایا کہ آپ کی رسالت کو سابقہ انبیاء سے ایک یہ بات بھی الگ کرتی ہے کہ ان کی امت کے لیے سارا روئے ارض مسجد بنا دیا گیا۔[12] تاہم ہفتہ وار جمعہ کی فرض باجماعت نماز ادا کرنے کے لیے ایک ایسی جگہ کی ضرورت تھی جہاں وہ یکجا ہو سکیں۔ اور پانچ فرض نمازوں کو بھی اگر جماعت سے ادا کرنے کی ہمیشہ بہت ترغیب دی گئی ہے چنانچہ مسجد کو اسلامی معاشرے میں جلد ہی ایک ایسی جگہ کی حیثیت حاصل ہو گئی جس میں کلام خداوندی کی تلاوت کی جاتی ہے اور جو اس تلاوت کے شایان شان ہو اس کی چار دیواری میں قرآن مجید کی گونج سنائی دیتی ہے اور اس کی تزئین و آرائش کا بڑا حصہ عموماً قرآنی خطاطی ہی پر

مشتمل ہوتا ہے۔

تلاوت کے حسن میں فطری طور پر ایک آہنگ اور زیر و بم شامل ہوتا ہے اور اس آہنگ کا انحصار ہے آواز کے تال میل اور حرف و صوت کے توازن پر۔ ہر پر کشش اور دل آویز آہنگ اور خوش الحانی کی تہ میں عددی نوعیت اور ماہیت کا ایک وجدانی فہم کارفرما ہوتا ہے یا زیادہ وضاحت سے کہیے تو وحدت اور کثرت کے مابین تعلق کی ماہیت کا ادراک کام کرتا ہے۔ اس طرح سمعی خطاطی بھی زبان سے ادا ہونے والے لفظ کو بصری توازن اور ہم آہنگی کے وسیلے سے ظاہر کرتی ہے۔ کلامِ خداوندی کے جمال کو خطاطی ایک حسی صورت میں ظاہر کر دیتی ہے۔

اہلِ مغرب کا جب پہلی مرتبہ اسلامی فن سے سامنا ہوتا ہے تو انہیں اس میں صورت گری اور فطرت نمائی Naturalism کا بظاہر فقدان نظر آتا ہے اور مجسمہ سازی سرے سے غائب ملتی ہے۔ اس کا تعلق کسی حد تک تو ان ہدایات سے ہے جو رسولِ خدا ﷺ نے شبیہ سازی Figurative آرٹ پر قدغن کے بارے میں جاری فرمائے تھے لیکن خود یہ ہدایات توحید کے مضمرات کی منطقی شکل میں ظہور سے عبارت تھے۔ وہ منفرد ربانی حسن کی نقالی انسان کر سکتا ہے اور اسے کرنا چاہیے قرآن مجید ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنا اظہار کیا ہے۔ صورتِ الٰہی کی لفظی اور سمعی aural تجسیم، وہ صورتِ الٰہی جس پر انسان کی تخلیق کی گئی۔ مرکزِ توجہ وحی خداوندی کو ہونا چاہیے کیونکہ یہ حد درجہ اہمیت رکھتی ہے کہ کلامِ خداوندی سے انسان کی توجہ جونہی ہٹائی جائے گی وہ اپنی صورت خداوندی کو ایک واقعیت دینے اسے عملی حقیقت بنانے میں ناکام ہو جائے گا اور شرک میں جا پڑے گا

سمعی فنون کے تجریدی ہونے پر اکثر تبصرہ کیا گیا ہے حتیٰ کہ سمعی فنون

کی نشانیاں ہیں، عکس و آثار ہیں۔ یوں تنزیہ و تشبیہ میں ایک توازن آ جاتا ہے۔ تنزیہ کی تجریدی کیفیت تشبیہ کی تمثال گری سے مل جاتی ہے کہ جب حسن و جمال کو ان اشیاء سے الگ کر کے دیکھا جا رہا ہے جن میں ظہورِ جمال ہوا ہے۔ جب ایک فنکار کسی حسین شے کی عکاسی کرتا ہے، کسی پیکرِ جمال کو اپنے فن میں ظاہر کرتا ہے تو دیکھنے والی آنکھ اس فنکار نے حسن کو اس پیکر، اس صورت سے منسوب کر دیتی ہے، خوبصورت چہرہ، دلکش پھول، حسین چیز وغیرہ وغیرہ۔ جب ان مخلوقات کی جگہ نسبتاً مجرد نقش و نگار پیش کیے جائیں تو ان میں ایک تنزیہی عنصر شامل ہو جاتا ہے، حسن کو اس کے محلِ ظہور سے الگ کر دیا جاتا ہے، جمال اور نقشِ جمال باہم دگر جدا ہو جاتے ہیں۔ پھر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ صورت و ہیئت کے توازن اور باہم آہنگی سے جمال پیدا ہوتا ہے۔ ہمیں یہ خیال کبھی نہیں گزرتا کہ کوئی شخص یا کوئی چیز اپنے طور پر خوبصورت ہے کیونکہ اس فن میں نہ انسانی شبیہ ہے نہ چیزوں کی تصاویر و اشکال۔

آگے چل کر جب اسلامی دنیا کے بعض علاقوں بالخصوص ہندوستان اور ایران میں مصوری نے ایک قدرے اہم حیثیت حاصل کر لی تب بھی اس کی نوعیت یہ نہیں ہوئی کہ محض لوگوں یا اشیاء کی صورت گری کی جائے۔ بلکہ ہوتا یہ رہا ہے کہ جن مناظر کی تصویر کشی کی جاتی تھی، وہ عموماً ان چیزوں کی عکاسی کرتے تھے جو اس مادی دنیا میں پائی ہی نہیں جاتی تھیں۔ مصوری کا موضوع اکثر جنت کے مناظر سے لیا جاتا تھا اور گاہے گاہے جہنم کی منظر کشی۔ جنت دوزخ یہ دو عالمِ خیال میں واقع ہیں۔ مثلاً ایرانی کسی بھی miniature مصوری کا ایک نمونہ دیکھ کر شاید ہی کوئی یہ گمان کرے کہ مصور نے جس منظر کی تصویر کشی کی ہے وہ اس نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہوگا۔ یہ منظر یا یہ صورت واضح طور پر ایک دوسری دنیا سے تعلق رکھتی ہوگی، اس کے اوصاف ایک

اور عالم کے اوصاف ہوں گے۔ وہ مسلمان ذہن میں اپنے دین اسلام کی روحانیت کا شعور موجود ہے یعنی ان کا مرکز احساس اس نکتے پر مستور ہے کہ ہر حقیقت اور ہر جمال اصل میں اللہ ہی سے ہے ان کے ہاں فنی پیکروں کو ایسے وسیلۂ ادراک کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے جس سے وہ اللہ کی نشانیوں کو ایک بے واسطہ طریقے سے، براہ راست انداز میں دیکھنے لگتے ہیں، عالم طبعی میں پائی جانے والی نشانیوں سے بھی زیادہ وضاحت سے۔

خلاصہ یہ کہ مذہبی فنون میں تخیل وخیال کا پیکر محسوس اور تجرید میں مضمر جوہر دونوں یکجا ہو جاتے ہیں۔ فن اسلامی میں جمال خداوندی کو خیال کے پیکر میں ظاہر تو کیا جاتا ہے لیکن اس عمل ظہور میں ظاہری جمال کی ہیئت، اس کے نقش وصورت کو مادی دنیا سے الگ کر دیا جاتا ہے۔ یہ آپ کے سامنے ایک ایسے نفس کی تصویر پیش کرتا ہے جس میں صورت خداوندی، اللہ تعالیٰ کے عکس جمال کا ظہور ہو رہا ہے فنی نقش نہ تو فقط روحانی ہوتی ہیں نہ صرف جسمانی بلکہ ان دونوں کے بین بین اور یہ بین بین چیز صرف خیال ہو سکتی ہے کہ خیال Imagination میں ہر دو طرف کی صفات مدغم ہو جاتی ہیں۔

اسلام کے بصری فنون میں صورت شکل کی عکاسی سے گریز ہے۔ اس کے بالکل برعکس معاملہ ہندومت، بدھ مت اور عیسوی روایت فن میں نظر آتا ہے۔ فن کی ان تینوں روایتوں میں انسانی صورت کی عکاسی، اس کی مجسمہ سازی اور مصوری ظہور فن کے بڑے اسالیب کے طور پر پروان چڑھے ہیں۔ تینوں تہذیبی اور فنی روایتوں میں اس عمل کا اصل محرک یہ تھا کہ اوتار کو اس کی انسانی تجسیم میں منعکس کیا جائے، اس کی صورت گری کی جائے۔ عیسوی فنون نے حضرت عیسیٰ کی شبیہیں

بنانے سے پہلے آغاز لیا کرتے ان کو خدا کا حلول مانا گیا تھا۔ اسی طرح ہندو فن میں دیوتاؤں کی تصویر کشی کی گئی ہے جو وجود دیتا ہیں (ان میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ انسانی اوصاف یا شکلیں پائی جاتی ہیں) دوسری طرف بدھ تہذیب میں فنون کا مرکز نروان یافتہ انسان ہے یعنی مہاتما بدھ یا بودھی ستو۔ اسلام کے نقطہ نظر سے دیکھیے تو بات کچھ اور ہو جاتی ہے۔ یاد رہے کہ اسلام ان تہذیبوں پر خارج سے ایک نظر ڈال رہا ہے، مسلمانوں کے لیے یہ ایک اجنبی منظر ہے۔ اسلام کے زاویہ نگاہ سے ان تینوں تہذیبوں نے "تشبیہ" پر ضرورت سے زیادہ زور دیا ہے۔ ان کے فنون اور ان کے اساطیر دونوں پر تشبیہی انداز غالب ہے۔ عملی اعتبار سے دیکھیے تو یہ چیز ہمیں دو باتوں میں جھلکتی نظر آئے گی۔ اوّل یہ کہ مسلمانوں میں بت پرستی کے خلاف ایک عمومی کراہت اور نفرت پائی جاتی ہے اور دوسرے یہ کہ عام طور پر مسلمان یہ سمجھنے کی کوشش کرنے پر آمادہ ہی نہیں ہوتے کہ ہندو اور بدھ مندروں میں جو مجسمے ہیں وہ اصلی معنوں میں بت یا اصنام عبادت نہیں ہیں۔ کم ہی مسلمان ہوں گے جو عظیم صوفی شاعر محمود شبستری (م ۷۲۰ھ/۱۳۲۰ء) کے مندرجہ ذیل شعر پر کھلے دل سے غور کرنے پر تیار ہوں گے۔

مسلماں گر بدانستی کہ بت چیست
بدانستے کہ دیں در بت پرستیست

اس سارے بیان سے ہمارا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم اسلامی یا اسلامی فنون سے وابستہ رہیں قرآن اور پیغامِ قرآن کے ظاہریوں تک محدود ہیں۔ ہماری غرض یہ ہے کہ قارئین کے سامنے یہ نکتہ واضح ہو جائے کہ چونکہ اسلام میں زندگی کا محور و مرکز قرآن مجید ہے لہٰذا خطاطی، صوت و صدائے خوش آہنگ، اسالیب اور فنِ تعمیر کی پہلوؤں پر مسلمانوں کی توجہ اس وجہ مرکوز ہوتی چلی گئی کہ فنی اظہار کی دیگر تمام شکلیں

ثانوی ہو کر رہ گئیں۔

مثال کے طور پر دیکھیے کہ آواز کے خوش آہنگ اتار چڑھاؤ کی ایک صورت موسیقی میں ظاہر ہوتی ہے۔ فن موسیقی نے اسلامی تہذیب میں خوب نشو و نما پائی ہے۔ اسلامی دنیا کے بعض حصوں میں موسیقی کو البتہ قدرے دور دور رکھا گیا ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ کچھ علماء نے یہ جانا کہ رسول خدا ﷺ نے موسیقی کو حرام قرار دیا تھا۔ لیکن موسیقی کی حرمت پر علماء کا اتفاق رائے نہیں ہے۔ ایک بات پر تمام علماء البتہ متفق ہیں اور وہ یہ کہ نفس انسانی پر موسیقی کا نہایت ہی طاقتور اثر ہوتا ہے نیز یہ کہ موسیقی کا یہ اثر عکس جمال بھی ہو سکتا ہے (یعنی جمال خداوندی کا انعکاس) اور نفس کو پراگندگی اور بکھراؤ کی طرف لے جانے والے آتشی (شیطانی) اثرات بھی۔ ان اثرات کے دیگر تمام نفسانی امکانات اس کے علاوہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر مسلمانوں کی نگاہ میں موسیقی ایک مشتبہ چیز ہی رہی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ یہی مسلمان تلاوت قرآن کرتے ہوئے ایک طویل فن اور اعلیٰ ترین درجے کے آہنگ کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اگر ان سے یہ کہیے کہ یہی تو موسیقی ہے تو جواب ملتا ہے کہ موسیقی تو سازوں سے ہوتی ہے یہ تو قرأت ہے اور تلاوت کتاب ہے۔ قرآن مجید کی تلاوت کبھی بھی کسی ساز کے ساتھ نہیں کی جاتی۔ خدا کے کلام کو ادا کرنے کے لائق اگر کوئی وسیلہ ہو سکتا ہے تو وہ صرف ایک ہی ہے، خود اللہ کے خلیفہ کی آواز۔

اسلامی دنیا میں آواز کے زیر و بم کا خوش الحانی اور آہنگ و قافیہ کے فن کا ایک اور بھی مظہر ہے جو قرآن مجید کی تلاوت سے بھی زیادہ عام ہے۔ ہماری مراد شعر خوانی سے ہے۔ شعر خوانی کو بلاشبہ اسلامی تہذیب کا سب سے بڑا ادبی مظہر کہا جا سکتا ہے۔ لیکن بہت سے جدیدیت زدہ لوگ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ قرآن کی

طرح شاعری بھی کبھی کتاب کی طرح پڑھی نہیں جاتی۔ اس کی باقاعدہ شعر خوانی کی جاتی ہے اور شعر خوانی کا سلیقہ طریقہ الگ ہوتا ہے۔ آج بھی کیفیت یہ ہے کہ اردو یا فارسی کے اہل زبان کے لیے یہ نہایت دشوار ہوتا ہے کہ وہ شعر کو بلند آواز سے پڑھیں اور اسے نثر کی طرح شعری آہنگ کے بغیر ادا کریں۔ ہاں بری شاعری کی بات اور ہے۔ اچھے شعر میں جو وزن اور آہنگ کی ایک قوت ہوتی ہے وہ پڑھنے والے کو عملاً مجبور کر دیتی ہے کہ وہ شعر کو لے کے ساتھ ادا کریں یا وزن و قافیہ کی رعایت سے پڑھے۔ جو شخص اپنی زبان کے حسن کو محسوس کرنے سے عاری ہو چکا ہو وہی اتنا گیا گزرا ہوگا کہ اپنی کلاسیکی شاعری سے اثر قبول نہ کرے

ساری شاعری کا نسبتاً کم حصہ ایسا ہے جس کا قرآن کے پیغام سے کوئی کھلا، ظاہر تعلق پیدا کیا جا سکے۔ اس کے جو عمومی سانچے بتائے جاتے ہیں وہ تقریباً درست ہی ہیں۔ فارسی ترکی اور اردو کے شاعر گل و بلبل کے قصے دہراتے نہیں تھکتے۔ مے نوشی و رقص، بادہ و ساغر، حسن یار کی باتیں ان کے عام موضوعات ہیں۔ اس قبیل کی شاعری کو ترجمے میں پڑھیے تو قاری جلد ہی بیزار ہو جاتا ہے۔ ہاں اگر مترجم کو خود ایک غیر معمولی شاعرانہ صلاحیت میسر ہو یا شعر کا موضوع رمز، قصہ یا صوفیانہ کلام ہو تو الگ بات ہے کہ یوں دلچسپی کا ایک پہلو پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی شعر اگر اصلی زبان میں پڑھیے تو معاملہ بہت مختلف نظر آئے گا۔ اسلامی زبانوں میں سے کسی ایک میں اگر آپ نے کبھی کسی اچھے شعر خواں کو، شاعری کو حسن و ادا کے ساتھ پڑھنے والے کو دیکھا ہو تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ شعر میں صرف اس کا تخیل اور اس کا موضوع ہی ایک اہم چیز نہیں ہوتا۔ فنکار اگر صاحب ہنر ہو تو اس کی گائیکی یا پڑھنے کے انداز ہی سے شعر اپنی موسیقیت، اپنے صوتی آہنگ کی وجہ سے سننے والے کے تخیل کو گرفت

میں لے لیتا ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ قرآن کے برعکس شاعری اکثر ساز و آواز کے سہارے پیش کی جاتی ہے۔ اس سے اس کی قوت اور تاثیر میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

اسلامی ادب کے تاریخ نگاروں کے ہاں اکثر یہ بحث چلتی ہے کہ مسلمانوں نے جو شاعری پیدا کی اس کا بڑا حصہ لادینی نوعیت کا ہے۔ مسلمانوں کی شاعری کے بارے میں یہ صرف ایک چلتی ہوئی رائے ہے اور قدرے جلد بازی سے کی ہوئی بات ہے۔ اصل وجہ تو اس کی یہ ہے کہ مسلمانوں میں دینی اور لادینی اور قدسی و دنیوی کے مابین اس طرح کی تفریق کبھی روا رکھی ہی نہیں گئی جیسی مغربی دنیا میں نظر آتی ہے۔ آخر الامر ہر شے اللہ کی نشانی ہے لیکن آیات خداوندی کو دیکھنے پرکھنے والی آنکھ ہر کسی کے پاس نہیں ہوتی۔ قرآن مجید بار بار انسانوں سے ان لفظوں میں خطاب کرتا ہے کہ "یا اولی الابصار" (اے آنکھیں رکھنے والو) اس سے یہ بات کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ ایسی آنکھیں اور ایسا ذہن رکھنے والے صرف اہل ایمان اور اہل تقویٰ ہی ہو سکتے ہیں۔ ادبیات کے ماہرین اس زمرے میں اکثر شامل نہیں ہوتے اور اسی کارن وہ اصناف ادب اور ادبی تخلیقات کو ادبی اصطلاحات اور ادبی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ہم عرض کر چکے ہیں کہ قرآن کا بیشتر حصہ حکایات اور امر و نہی اور تہذیبی نکات پر مشتمل نہیں ہے۔ اس کے برعکس اس کے بنیادی پیغامات میں سے ایک یہ ہے کہ انسان کو حسن کی پہچان بھی ہونا چاہیے اور حسن پر عمل کرنا چاہیے۔ یہ حسن صرف سیرت و کردار اور اخلاق و عمل کا حسن ہی نہیں ہے، صوت و صدا میں بھی حسن ہے اور دیدہ بصر میں بھی۔ انسان کا عمل اور برتاؤ حسین ہونا چاہیے، اس کی خوبصورت ہونا چاہیے اور اس کی بات میں حسن کلام جھلکنا چاہیے۔ بہت سے مسلمان، خاص طور پر اسلام کی تیسری جہت کی نظریاتی بنیادوں پر گرفت رکھنے

وسیع معنوں میں تصوف، کہتے ہیں کہ حسن و جمال جہاں بھی ہو جمال خداوندی ہی کا ایک ریزہ ہے۔ اس سے انسان میں یہ وجد پیدا ہوتا ہے۔ اپنی ماہیت کے اعتبار سے یہی جمال خداوندی محبت کو حرکت میں لاتا ہے اور محبت کبھی بھی آنی جانی اور عارضی چیزوں سے مطمئن نہیں ہوتی۔ عشق اللہ تک لے جاتا ہے جو واحد جمال حقیقی ہے۔ "اللہ جمیل و یحب الجمال"۔ اسی طرح جس حد تک انسان اپنی صورت تزکیہ کا تحقق کرتا چلا جاتا ہے اسی قدر جمال خداوندی سے محبت کرنے لگتا ہے اور یہ جان لیتا ہے کہ "جمیل واللہ" اس کے سوا حسن و جمال تو بس اس کے جمال کی، جمال خداوندی کی ایک شعاع ہے۔ محبت کسی بھی شے کی ہو آخر میں ہوگی ایک شعاع جمال کی محبت اور تجزیہ کرتے جائیے تو مآل کار یہ محبت اللہ کی محبت نکلے گی۔[13]

مسلمانوں کے تجربے میں محبت ایک اہم کردار کیوں ادا کرتی ہے اس کی مندرجہ بالا وضاحت ایک نسبتاً مجرد اور کتابی انداز کی ہے۔ شعر میں یہی بات جس طرح بیان ہوتی ہے وہ اس سے کہیں زیادہ سیدھی اور دل میں اترنے والی ہے۔ مولانا روم فارسی کے عظیم ترین شعراء میں سے ہیں۔ محبت اور جمال الٰہی کی سچی نوعیت کے بارے میں جو وہ کہہ سکتے ہیں وہ دوسرا کوئی کم ہی بیان کر پائے گا۔ افسوس کہ ہم اردو ترجمے میں ان کے شعر کی نغمگی اور اس کے جادو بیان اسلوب کو منتقل کرنے سے قاصر رہیں گے۔ آپ یوں تصور کیجیے کہ آپ نے آج تک جو حسین ترین نغمہ سماعت کیا ہے وہ آپ کو سنایا جا رہا ہے لیکن گانے والا کیا کہہ رہا ہے اس پر بھی غور کرتے جائیے۔[14]

اسلامی فنون و ہنر کی اس نہایت مختصر بحث کا خلاصہ ہم یوں کر سکتے ہیں کہ قرآن مجید نے خیر اور حسن و جمال کو صفاتِ خداوندی کے طور پر بار بار بیان کیا ہے اور اس سے مسلمانوں میں طرح طرح کے فنون کی ایک کثیر تعداد کی نشوونما کا حوصلہ پیدا ہوا کیونکہ خیر اور حسن اگر صفاتِ خداوندی ہیں تو قرآن کے مطابق انسانوں میں ان صفات کا پروان چڑھنا ایک اچھی اور مستحسن چیز ہے۔ فقہا نے ان فنون میں سے بعض کے جائز اور ناجائز ہونے پر بسا اوقات اعتراضات کیے ہیں لیکن عمومی رویہ یہی رہا کہ مسلمانوں کے طرزِ احساس میں اسلام کی تیسری جہت کو ہمیشہ کافی اہمیت دی گئی اور مسلمانوں نے ہمیشہ اس بات کو تسلیم کیا کہ صورت و ہیئت کا حسن بھی انسانی زندگی کے لیے اتنا ہی ضروری اور اہم ہے جتنا کہ حسنِ عمل، حسنِ سیرت اور باطن کے اندر کا حسن۔ نوعِ انسانی کو اس دنیا میں اس لیے پیدا کیا گیا ہے کہ وہ اپنے نفسوں کو صورتِ الٰہیہ سے ہم آہنگ کر کے نشوونما دے اور یوں اسے قربِ خداوندی حاصل ہو سکے۔ یہ قربِ خداوندی انسانیت کی منصب ہے اور اس قرب کی سطح پر پہنچنے کے لیے عمل اگر ہے تو اسے شرعی احکامات کے پیمانے پر پورا اترنا چاہیے، فکر و فہم کو الٰہیات سے ہم آہنگ ہونا چاہیے اور اخلاق و کردار کی صورت گری احسان، اخلاص اور تقویٰ کی بنیاد پر ہونا چاہیے۔ جس دین میں تصورِ کائنات اتنا جامع ہو اور جس کا تناظر ہر شے کو اپنے آغوش میں لیے ہوئے ہو اس میں انسان کے طبعی ماحول اور اس کے گرد و پیش کی مادی دنیا کو کیونکر نظر انداز کیا جا سکتا تھا۔ اس معاشرے میں ہر شے کو جانچنے کا پیمانہ جمال تھا لیکن وہ جمال جس کو نظریۂ توحید نے متعین کیا ہو اور جس نے توحید کے تصور کے مطابق صورت و شکل اختیار کی ہو۔

فن اور ہنر کی دنیا میں جو جمال ظاہری نظر آتا ہے وہ محض اللہ تعالیٰ کے جمال

تخلیق کا عکس ہے۔ نفسِ انسانی کو اگر اپنی صورت خداوندی کے پیمانے پر پورا اترنا ہے تو نہ صرف اس کا عمل ایسا ہونا چاہیے جسے حسنِ اخلاق اور حسنِ عمل کے مطابق کہا جا سکے بلکہ ہیئت و صورت کے میدان میں بھی اسے ظاہری جمال کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ دوسری طرف سے دیکھیے تو ظاہر کا حسن، خارج کا جمال، ایک سہارا بن جاتا ہے جس سے نفس کے حسن کو جلا ملتی ہے۔ انسان کا ماحول خوبصورت ہو، عناصر جمال سے آراستہ ہو تو انسان کو ایک توازن، ہم آہنگی، اعتدال و مسرت کا احساس رہتا ہے اور یہ کیفیت نفسِ انسانی کی مطلوبہ صفات کی نشوونما میں معاون ہوتی ہے

تصوف عملی

صوفیاء کی تعلیمات کے نظری حصے سے ہم کسی قدر تفصیل سے بحث کر چکے ہیں اور ہم نے اس نکتے کی وضاحت بھی کی تھی کہ تصوف کا نقطۂ نظر کس طرح فلسفے اور علم کلام سے مختلف ہے۔ اب ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ تصوف کو کس اعتبار سے "احسان" کا ایک مظہر کہا جا سکتا ہے، احسان یعنی وہ کرنا جو خوبصورت ہو یا دوسرے صحیح الفاظ میں کہیے تو وہ "ہو" جانا ہے۔

عملی تصوف بھی فقہ، کلام، فلسفہ اور عرفانِ نظری کی طرح ایک بہت پھیلا ہوا اور پیچیدہ مظہر ہے۔ صوفیاء نے خود بھی تصوف پر لاتعداد کتابیں لکھی ہیں اور ادھر کے کچھ برسوں میں مغربی اہلِ قلم نے بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ ان کی تحریروں میں مسلم معاشرے اور اسلامی تہذیب کے ان تمام مختلف مظاہر پر تحقیق کی گئی ہے جسے تصوف کے عنوان کے تحت سمیٹا جا سکتا ہے۔ تاریخ میں تصوف نے جو شکلیں اختیار کی ہیں ان کا جائزہ لینا شروع کیجیے تو کتنے ہی پیچیدہ مباحث سر اٹھانے لگتے ہیں۔ ان پر گفتگو کا آغاز کرنا بھی ہمارے لیے یہاں ممکن نہیں ہے۔ اس لیے ہم صرف اتنا

عرض کریں گے کہ تصوف ایک عنوان ہے، ایک نام ہے جو سہولت کی خاطر اسلام کی تیسری جہت کے بہت سے مظاہر کے لیے برتا جاتا ہے۔ سہولت کی بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ اصطلاح خود اسلامی تہذیب کے بطن سے پھوٹی ہے اور اسے عام طور پر انہی معنی میں استعمال کیا جاتا ہے جو ہمارے پیش نظر ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ تصوف کے مفہوم کے بارے میں اُلجھنیں بھی گاہے بگاہے ظاہر کی جاتی رہی ہیں۔ چونکہ یہ اصطلاح خود اسلامی تہذیب ہی کی وضع کردہ ہے لہٰذا اس میں وہ سب خرابیاں نہیں ہیں جو اس کے انگریزی مترادفات میں پائی جاتی ہیں۔ ان مترادفات میں سرفہرست ہے mysticism جس کا پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے اور جو ہمارے خیال میں سرے سے غیر موزوں ہے۔

تو پھر عملی تصوف کیا ہوتا ہے؟ وہ یہ کہ نظری تصوف کو اپنے یومیہ معمولات اور روز مرہ کے ذریعے عمل میں لانا، اسے عملی شکل دینا۔ نظری تصوف ہمارے لیے توحید کا ایک ایسا تصور فراہم کرتا ہے جس کی بنا کشفِ حقائق پر استوار ہوتی ہے نیز نظری تصوف کو وحی قرآنی میں ایک پختہ بنیاد میسر ہے۔ علاوہ ازیں نظری تصوف کے کئی مظاہر ایسے ہیں جن میں عقلی تفتیش و تحقیق کے لیے ایک احترام اور گوارا کرنے کا رویہ پایا جاتا ہے اگرچہ یہاں بھی نظری تصوف کو معقولات کے باب میں کوئی زیادہ امید اور خوش فہمی نہیں ہے۔ تصوفِ نظری کے تصورِ توحید کے مطابق انسان میں اگر صرف تنزیہ پائی جائے تو یہ اس کے کمال میں ایک نقص کے مترادف ہے اور کمالِ انسانی تب حاصل ہوتا ہے جب تشبیہ سے متعلق تمام صفاتِ الٰہی کو انسان اپنے اندر ایک واقعیت میں بدل دیتا ہے۔ انسان مکمل طور پر انسان تبھی بنتا ہے جب اس میں صورتِ خداوندی کا تحقق ہو جاتا ہے۔ اس مقصد سے صوفیہ رسولِ خدا ﷺ کی سنت کا

اتباع کرتے ہیں اور قرآن مجید کو مجسم عمل بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ قرآن ان کا اخلاق بن کر رہ جائے جیسا کہ وہ رسول خدا ﷺ کی سیرت تھی، خلق محمدی تھا۔

عملی تصوف بنیادی طور پر انسان کے اوصاف و اخلاق سے متعلق ہے۔ تصوف کی ایک عام تعریف یہی کی جاتی ہے کہ تصوف تہذیبِ اخلاق کا نام ہے۔ ایک اور تعریف میں یوں کہا گیا ہے کہ تصوف سراسر ادب ہے۔ انہی تعریفوں کے اسلوب میں ابن عربی ؒ یہ بتاتے ہیں کہ تصوف کا مطلب ہے اخلاق خداوندی کو اپنا لینا۔ (التخلق باخلاق اللہ) ان چند عبارتوں کے مضمرات پر غور کیجیے تو تصوف کے عملی پہلو کی غرض و غایت کھل کر سامنے آ جائے گی۔

سابقہ سطور میں ہم نے تہذیب اخلاق rectification of character کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ اس اصطلاح کے مضمرات پر گفتگو اور وضاحت سے پہلے ہم یہ بتانا ضروری سمجھتے ہیں کہ یہی اصطلاح فلسفیوں کے ہاں بھی استعمال ہوئی ہے اور اس سے ان کی مراد ہے فلسفے کے مقاصد میں سے ایک بڑے عملی مقصد کی نشاندہی۔ اخلاقیات کا سارا میدان فلسفے کا ایک ذیلی شعبہ ہے اور اس کا موضوع ہی یہی ہے کہ اخلاق و صفات کی ماہیت پر غور و فکر کیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ انسان کی تہذیب اور درستگی کیونکر ہو سکتی ہے۔ بلاشبہ مسلمان فلسفیوں کے مکتب فکر میں اخلاقیات محض ایک نظریاتی بحث کبھی نہیں رہی۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ فلسفہ کیا ہے، ایک طریقہ ہے جسے اصل میں اس مقصد کے لیے برتنا چاہیے کہ انسان ایک بہتر شخصیت بن سکے۔ اس اعتبار سے فلسفیوں اور اہل تصوف میں فرق یہ ہے کہ صوفیا کے ہاں رسول اللہ ﷺ کے اخلاق کاملہ کا مجسم نمونہ ہونے پر زور دیا جاتا

ہے اور آپ کی سنت کو وہ درجہ قرار دیا جاتا ہے جس کے اندر اخلاق حمیدہ کا حصول عملاً ممکن ہوتا ہے۔ بعد ان دور کے فلسفیوں کے ہاں اپنے فلسفیانہ نقطہ نظر سے عمومی مناسبت کی وجہ سے حدیث و نبوی کی پیروی کی ضرورت پر کوئی خاص زور نہیں دیا جاتا تھا۔ اخلاقیات پر بحث کرتے ہوئے صرف یونانی مدرسہ بالخصوص ارسطو کو سند بنایا جاتا تھا۔ اپنی ذاتی زندگی میں وہ اسلام کو اچھے سیرت و اخلاق کے لیے ایک لازمہ جانتے تھے یا نہیں اس امر کا پتہ ان کی تحریروں سے نہیں چلتا۔ جبکہ صوفیاء کے لیے اسلام ایک بنیادی اور اٹل شرط کی حیثیت رکھتا ہے

فلسفیوں کے ہاں اس موضوع کو اخلاقیات کہا گیا ہے۔ 'اخلاق' جمع ہے 'خلق' کی جس کے معنی ہیں سیرت و کردار۔ اسی سے تہذیب اخلاق کی اصطلاح بنی۔ خلق کے لفظ سے مراد عمومی کردار ہی نہیں ہوتا بلکہ اخلاقی اوصاف۔ پس اخلاقیات کا مطلب ہوا اوصاف و صفات عالیہ کا مطالعہ۔ ایک نہایت اہم نکتہ یہ بھی ہے کہ عربی میں 'خَلق' (تخلیق) اور 'خُلق' کو ایک ہی طرح لکھا جاتا ہے۔ انسان کا خُلق Character ویسا ہی ہوگا جیسے اسے خَلق کیا گیا ہے۔ تقدیر کی دلیل کے طور پر ایک حدیث اکثر پیش ہوتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ "اللہ نے خَلق اور خُلق مقدر کر دیے ہیں"[11] تاہم انسان مرتے دم تک خُلق سے فارغ نہیں ہوسکتا۔ دراصل انسان اپنی زندگی جس طور بسر کرتا ہے اور اپنی آزادی اختیار سے جو طرز زیست اس نے چنا ہوتا ہے اس کے وسیلے وہ اپنے سیرت و کردار کی تعمیر و تخلیق میں شریک رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول خدا کو ہم دعا کرتے ہوئے پاتے ہیں کہ "الٰہی! تو نے میرے خَلق کو جیسا عطا کیا ہے میرے خُلق کو بھی حسین بنا دے"۔ تہذیب اخلاق کا اگر یہ امکان نہ ہوتا تو اللہ کی طرف لوٹنے کا معادِ اختیاری کا مدار

تصور ہی بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔

"تہذیب اخلاق" کی اصطلاح اس نکتے کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ کسی بھی انسان کے لیے اس کا اخلاق اور مختلف اوصاف بھی کسی حتمی شکل میں نہیں آتے۔ انسان خود کو بدل سکتا ہے، بہتر انسان بن سکتا ہے۔ لیکن اخلاق کو تہذیب دینے کی اس بحث میں توجہ کا مرکز انسان کا عمل نہیں ہوتا۔ گفتگو ان صفات کے بارے میں رہتی ہے جو انسان کے اخلاق اور کردار کی تشکیل کرتی ہیں۔ آج کی اصطلاح میں اس چیز کو غالباً "شخصیت" Personality کا عنوان دیا جائے گا۔ جب ہم یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ فلاں صاحب کی شخصیت کیسی ہے، تو ہمیں توقع یہ ہوتی ہے کہ جواب میں ہمیں ان کے اوصاف، اخلاق کے بارے میں بتایا جائے گا۔ لیکن فی زمانہ ہوتا یہ ہے کہ اس طرح کی گفتگو میں اکثر بہت عمومی نوعیت کے الفاظ اور سرسری طور پر اظہار کو وسیلہ بنایا جاتا ہے اور جواب کچھ یوں ہوتا ہے کہ فلاں صاحب "اچھے ہیں"، "وہ بہت ہیں"، "نارمل ہیں"، "عجیب سے ہیں"، "قاعدے کے آدمی ہیں"، "قابل نفرت ہیں"۔ اسلام کے نقطہ نظر سے دیکھیے تو قرآن مجید بہت سی صفات کو اہل ایمان اور اہل تقویٰ سے منسوب کرتا ہے اور یہ سب صفات ایسی ہیں جو انسان میں پیدا کرنا مطلوب ہے۔ بہت سی دوسری صفات ہیں جو منکرین حق اور کفار کی صفات بتائی گئی ہیں جن سے انسان کو بچنا چاہیے۔ جہاں تک فلسفہ کا تعلق ہے تو وہ ان مباحث کے لیے زیادہ تر یونانی علوم سے اخذ کردہ اصطلاحات استعمال کرتے تھے گو ان اصطلاحات میں سے بہت سی اصطلاحات قرآنی الفاظ پر مشتمل تھیں۔

"تہذیب" کا لفظ جس کو انگریزی میں rectification کی اصطلاح سے

ترجمہ کیا جاتا ہے اس کے بنیادی معنی ہیں "کتربیونت، آراستہ و پیراستہ کرنا، ستھرا کرنا، اجالنا"۔ سو ہمارے پاس ایک ایسی شخصیت ہوں جس پر کام کرنا درکار ہے۔ تمام ناگوار و ناپسندیدہ اوصاف کو کاٹ چھانٹ کر الگ کر دینا ہوگا اور تمام اچھے خواص و اوصاف کو نکھار کر اسے صیقل کرنا ہوگا۔ اصل بات تو یہ ہے کہ کوئی بھی اور قابل تعریف صفت ایسی نہیں ہے جسے حاصل کرنا درکار ہو کیونکہ فطرت و سرشت انسانی میں ہر اچھی اور پسندیدہ صفت پہلے سے پائی جاتی ہے کہ یہ فطرت صورتِ خداوندی پر تخلیق کی گئی ہے۔

ہم نے ابتدائی زمانے کے ایک صوفی مصنف کا قول نقل کیا تھا کہ تصوف سراسر ادب ہے۔ "ادب" کا لفظ ایک بہت ہی پرمعنی اور نہایت جامع تصور ہے جس کے سہارے اسلام کے مجموعی مزاج تک کو بیان کیا جا سکتا ہے۔ اس لفظ کے بنیادی معنی، اس کے مادے کے معنی میں "بلانا، ضیافت کے لیے مدعو کرنا"۔ اس کے ثانوی معانی اس امر کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ قبل اسلام میں بھی اور اسلامی تہذیب میں بھی مہمان داری کی اہمیت تھی "ابن سبیل" (راستے کی اولاد) یعنی مسافر کو قرآن مجید نے ان لوگوں میں شمار کیا ہے جن پر زکات کا مال صرف کیا جا سکتا ہے۔ ساری اسلامی تاریخ میں مسافر کو کھانا کھلانے اور اس کی دیکھ بھال کو ایک مذہبی اور اخلاقی فریضے کے طور پر دیکھا گیا ہے۔

"ادب" کا تصور آگے چل کر ایک حتمی شکل میں اس طرح پروان چڑھا اس کا کہ صرف ایک معمولی سا جزو یہ ہے کہ آپ مسافر یا انجانے لوگوں کی مدد کریں اسلامی تاریخ کی ابتدائی زمانے ہی سے ادب کے لفظ کا مطلب یہ لیا جاتا تھا کہ انسان کے نفس کی صحیح تربیت اور پرداخت کی جائے اور اس کا عمل صحیح سانچے میں

ڈھلا ہوا ہو۔ اس کے بنیادی معنی یہ ہونے کہ اسلامی علوم اور عملی معاملات کے تمام میدانوں میں مناسب اور موزوں تعلیم و تربیت جو ہر اس شخص کے لیے ضروری ٹھہرتی ہے جسے اپنے دین کے آدرش اور درجہ کمال کا حصول مطلوب ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے وسیع مفہوم میں "ادب" اور سنت نبوی ہم معنی قرار پاتے ہیں کیونکہ سنت میں آپؐ کا سیرت و اخلاق بھی آ جاتا ہے اور آپؐ کا عمل بھی۔

تاہم یہ بات یقینی ہے کہ "ادب" اپنے مفہوم میں کوئی محدود تصور نہیں تھا۔ مثلاً آپ اسے فقہاء کے شذرات یا علم کلام کے ماہرین کے مباحث تک محدود نہیں کر سکتے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا دائرہ صرف شریعت پر عمل کرنے کے احکامات بتانے یا قرآن و حدیث کا دفاع کرنے والے علماء پر جا کر رک نہیں جاتا تھا۔ یہ ہر ذی علم شخص کی منزل اور آدرش تھا بلکہ بڑی حد تک ہر اس شخص کا جو اسلامی تعلیم و تربیت کے عمل سے گزرتا تھا۔

اسلامی زبانوں میں جب کسی شخص، مرد و زن میں سے کسی کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ با ادب ہے تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ وہ مہذب اور شائستہ اطوار ہے، نفاست اور سلیقہ رکھتا ہے اور بحیثیت عمومی اس کی اچھی پرورش ہوئی ہے۔ "ادب" کا لفظ ادبی تحریروں بالخصوص شاعری کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ یہ چیز بھی عام ہے کہ ایک با ادب شخص کو ہزاروں بہترین اشعار زبانی یاد ہوں اور وہ انہیں برمحل طور پر استعمال کر سکتا ہو۔ اس طرح یہ بھی ناقابل یقین بات ہو گی کہ کسی زمانے کے کسی شخص کے بارے میں یہ بیان کیا جائے کہ وہ بڑا "با ادب" تھا اور اس کا خط بہت ہی خوبصورت نہ ہو۔ بہت سی اسلامی زبانوں میں کسی شخص کے بارے میں جو بدترین باتیں کہی جا سکتی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ "بے ادب" ہے۔

یہ ایسا ہی ہے جیسے آپ یہ کہہ دیں کہ فلاں شخص، وہ آدمی جہاں وہ تو ہندو ہے یا عیسائی ہے۔

"ادب" کا لفظ معاشرے کے ہر طبقے کے لوگوں کے صحیح دستور العمل کے لیے بھی بولا جاتا تھا اور ان تمام کاموں کے لیے بھی جو فرد کے لیے مناسب اور پسندیدہ قرار دیے جاتے تھے۔ قاضی کے لیے ادب، صوفی مریدین کا ادب، منشیوں کے لیے ادب، اہل دربار کا ادب، طبیبوں کے لیے ادب، موسیقاروں کا ادب، بلکہ گھریلو مسلمان عورتوں کے لیے ادب کے موضوع پر کتابیں لکھی جاتی تھیں۔ باربرا مٹکاف کی مندرجہ ذیل عبارت یوں تو جنوبی ایشیا کی اسلامی تہذیب کے بارے میں ہے مگر یہ باتیں اسلام کے بارے میں ہر جگہ اور زمانے میں درست ہیں۔ اسلام جب بھی قائم ہوگا ایسا ہی ہوگا۔

اہل تصوف کی تحریروں میں یہ ظاہر ہے، علما اور زہاد کے عمل میں مضمر ہے، سلاطین اور درباریوں کے لیے ادب آموز کتابوں اور ادب قاضی اور ادب مفتی میں مرتب کیے ہوئے ہے، روزمرہ کے خوشگوار رویوں کی معیت ان پر بھی ہوتی ہیں اور عوام کی مذہبی اور اخلاقی پند و نصیحت کی کتابوں تک بھی جگہوں پر ادب کا تصور وہ کلیدی تصور ثابت ہوتا ہے جس سے آپ جنوبی ایشیا کی اسلامی تہذیب کے مذہبی تصورات تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔۶

مٹکاف کا کہنا یہ ہے کہ اسلامی تعلیم نے تین میدان لیے ہیں جن میں تصوراتی طور پر ایک دوسرے سے تمیز کیا جا سکتا ہے یعنی شریعت، اہل تصوف کا راستہ یعنی طریقت اور "ادب"۔ ان میں ہر شعبے کے ماہرین الگ ہیں۔ ان کے خیال میں ان تینوں اقالیم میں ایک سے اسلامی حقائق ظہور کرتے ہیں۔ "تاہم چونکہ یہ سب شعبے ایک

اصل میں رسولِ خدا کے عمل کو ایک ضابطے کی شکل دینے اور منظم کرنے کی کوششوں سے عبارت ہیں [illegible] پہنچی تھی اور آخری صورت میں یہ سب اسلام کے مرکزی دھارے میں آ کر ایک ہو جاتے ہیں۔" لیکن اس کے ساتھ ہی مصنف نے یہ اعتراف بھی کیا ہے کہ "خود ادب بھی تو دوسرے دو شعبوں کی تقسیم پر ہی ہے" نکلا اور یہی وہ نکتہ ہے جس پر ہم یہاں زور دینا چاہتے ہیں۔ ادب کو ایک الگ شعبہ اور الگ میدان قرار دینے کی بجائے یوں کہنا چاہیے کہ ادب وہ میدان ہے جہاں آ کر اسلام کی تیسری جہت کے مقاصد اور آدرش کا دوسری جہت کے مقصود و مطلوب سے تال میل پیدا ہو جاتا ہے

جب "ادب" کا مطلب ہو وہ ضابطہ جو عمل کو درست رکھنے کے لیے طے کیا گیا ہو۔ یہ ضابطہ اپنے ہدف اور اپنے سیاق و سباق کے لحاظ سے مختلف ہو سکتا ہے۔ اگر اسے صرف اعمالِ ظاہری تک ہی محدود کر دیجیے تو اس کا مرکز کچھ اور ہو جائے گا فقہ یا علم الاخلاق پر مرکوز ہو تو اس کی صورت اور ہو گی اور احسان (حسنِ عمل کی داخلی جہت) یا اہلِ تصوف کے ہاں جو زور دیا جاتا ہے اس کو مرکز بنایا جائے تو ادب ایک الگ چیز ہو گا۔ فقہ پر جو کتابیں لکھی جاتی ہیں وہ اسلام کی پہلی جہت تک محدود ہوتی ہیں۔ ان کے برعکس "ادب" کے متعلق کتب میں لکھنے والوں کی توجہ صحیح عمل پر بھی رہتی ہے اور درست رویے اور صالح اخلاق بھی ان کا موضوع بنتے ہیں۔ اس طرح ان مصنفین کے ہاں اسلام کی پہلی اور تیسری جہت دونوں یکجا ہو جاتی ہیں۔ مزید برآں یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ایسی کتب بالعموم اسلام کی دوسری جہت کی آغوش میں پروان چڑھنے والے ادیب یا ایک سے زیادہ نقطہ ہائے نظر پر براہِ راست یا بالواسطہ طور پر مبنی ہوا کرتی ہیں۔

ادب جہاں بھی ہوگا وہاں اس کے ساتھ حسن، نفاست، شائستگی اور تہذیب و لطافت کا شعور بھی موجود ہوگا۔ بلکہ اس سلسلے میں تو یہاں تک کہا جا سکتا ہے کہ ادب کی اخلاق انسانی کے میدان میں وہی حیثیت ہے جو صوت و صدا کے عالم میں موسیقی اور آہنگ کی ہے یا جو حیثیت خطاطی اور فن تعمیر کو بصری قوت کی دنیا میں دی جاتی ہے۔ ان تینوں اقالیم میں ہر فنی مظاہر کی تہ میں جو جذبہ عمل کارفرما ہے وہ تلاش جمال کا ہے، تجسیم جمال کا ہے۔ یعنی یہ کہ حسن و جمال کو ایک قالب، ایک پیکر عطا کیا جا سکے اور اس داخلی ہم آہنگی، وحدت اور اعتدال و توازن کو ظہور میں لایا جائے جو توحید کا لازمی تقاضا ہے۔ مصنف نے اس نکتے کی وضاحت کی ہے کہ "ادب" کا لفظ اگرچہ ظاہری رویے اور عمل کی طرف اشارہ کرنے کے لیے مستعمل کیا جاتا ہے تاہم اس کی حیثیت دوہری ہے۔ یہ بیک وقت انسان کے درونِ ذات، اس کے اندر کے انسان کی علامت و نمود بھی ہے اور اس اندر کے انسان کے عمل کا پھل بھی۔ جاننا، کرنا اور ہونا۔ علم، عمل اور وجود، ایک دوسرے سے کسی طرح الگ نہیں کیے جا سکتے۔"[18] بالفاظِ دیگر "ادب" ان صورتوں میں سے ایک کا نام ہے جن میں اسلام کی تینوں جہات ایک کامل ہم آہنگی کے ساتھ مل کر اس دین کے ٹھوس اور واقعی انسانی آدرش کو ظاہر کرتی ہیں۔

اہل تصوف نے اگر یہ کہا ہے "تصوف سراسر ادب ہے" تو ان کے پیش نظر یہ نکتہ ہے کہ انسان کا ہر عمل درست ہونا چاہیے یعنی اسے سنتِ نبوی کے مطابق ڈھلا ہوا ہونا چاہیے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب انسان کے نفس میں توازن اور ہم آہنگی ہو، اس کے بکھرے ہوئے عناصر اور میلانات کو اخلاص، تقویٰ اور احسان نے مجتمع کر کے ایک کلیت عطا کر دی ہو۔ مزید برآں "احسان" یعنی حسنِ عمل کو [illegible]

اور جمیل جو شستگی اس کے لیے بناوٹ اور دکھاوے کا کام آتا ہے۔ ان چیزوں سے اس کی بے ساختگی برباد ہو جاتی ہے اور بے ساختگی عمدہ چیزوں کے حسن میں سے ایک عنصر جاتا رہے گا۔ حسن عمل یعنی حسن فہم و عمل تو نفس انسانی میں چشمے کی طرح بہنا چاہیے یا شعری زبان میں کہیے تو یوں ہو گا کہ جیسے پھول سے اس کی مہک پھوٹتی ہے اسی طرح انسان سے اس کا حسن فہم و عمل و نیت ظاہر ہونا چاہیے۔ حسن عمل کی بنیاد انسانی ہستی کے حسن پر ہے جس سے عمل ظہور میں آ رہا ہے۔ مظفر کے الفاظ میں ”علم، عمل اور وجود ایک دوسرے سے کسی طرح الگ نہیں کیے جا سکتے“

تجسیم جمال کا مطلب ہے صفات خداوندی کی تجسیم، ان صفات سے خود کو مزین کرنا (تخلق باخلاق اللہ)۔ یہ ابن عربی کا نقطہ نظر ہے جو تصوف کی اس تعریف میں نظر آتا ہے جو ان سے منسوب ہے۔ اس تعریف کے مطابق تصوف کا مطلب ہے ”تخلق باخلاق اللہ“ (اخلاق خداوندی کو اپنانا) اس کی وضاحت ابن عربی نے یوں کی ہے کہ اخلاق خداوندی اپنانا ایک کہنے کی بات ہے ورنہ اصل میں یہ سب اخلاق و صفات انسان کی سرشت میں پہلے سے موجود ہیں کیونکہ انسان صورت خداوندی پر تخلیق ہوا ہے لیکن یہ اخلاق اللہ کے اخلاق ہیں اور جب تک انسان اپنی سرشت و فطرت سے منہ موڑے رہتا ہے اس کے اندر موجود صفات خداوندی صحیح ہم آہنگی اور توازن کے ساتھ ظہور میں نہیں آ سکتے۔

یہاں ایک نکتہ پیش نظر رہنا ضروری ہے مسلمانوں نے کبھی بھی ’اخلاص‘ اور ’حسن‘ کو محض اضافی، حسیاتی یا نفسیاتی حیثیت سے معترف نہیں جانا ان کے لیے یہ دونوں بندگی کرنے کا ایک طور ہیں، ایک انداز ہستی جو اس غیر حقیقی مخلوق کو الحق سے ہم آہنگ کرواتا ہے اور اس طرح مخلوق کے انداز زیست اور اطوار

ہستی ہو وہ قطعاً بدل کر رکھ دیتا ہے۔ اس نوعیت کا وجودی تغیر، تقلبِ ماہیت ہی سے اس امر کی توضیح ہو سکتی ہے کہ انسان اللہ کا قرب کیسے حاصل کر سکتا ہے۔ اس کا قرب جو حقیقی ہے، الحق ہے۔

جنت میں جانا ایک کمرے سے اٹھ کر دوسرے میں جا بیٹھنے کی طرح کا عمل نہیں ہے۔ بلکہ انسانی فطرت کی ایک مکمل قلبِ ماہیت، اس میں ایسے تغیر کا نام ہے جس سے ایک نیا مکمل ہستی ظہور میں آتا ہے۔ مسلمان مصنفین نے اس تبدیلی کو بیان کرنے کے لیے اکثر کیمیا گری کی ایک تمثیل استعمال کی ہے۔ کیمیا گری میں آپ یہ نہیں کرتے کہ سیسے کے ایک ٹکڑے کو اس کمرے سے اٹھا کر کہیں منزلیں باہر لے جائیں جہاں وہ اپنی باقی زندگی ہنسی خوشی گزار دے۔ اس کی بجائے سیسے کے ذرے ذرے کی ماہیت اس طرح تبدیل کی جاتی ہے کہ اس میں صرف خالص سونا باقی رہ جاتا ہے۔ پھر یہ سیسہ، جو اب سیسہ نہیں سونا بن چکا ہے، تاج شاہی کے لائق ہو جاتا ہے۔ سیسے کا وہ ٹکڑا جو اپنی تیرہ سرشت کو باقی رکھنے پر مصر ہو اس کی پرواہ نہ تو بدوش کو ہوتی ہے نہ کیمیا گر کو۔ ایسے ٹکڑے کو زمین کی گہرائی میں پھینکتے لاوے میں پھینک دیا جاتا ہے اس کی جگہ یہی ہو جاتی ہے۔

احسان کے وسیلے سے بندگانِ خدا اس کی عبادت یوں کرتے ہیں گویا کہ اسے دیکھ رہے ہوں۔ درجہ بدرجہ، رفتہ رفتہ ان کی نگاہ اپنی بے حقیقتی سے ہٹتی چلی جاتی ہے اور حق مرکزِ توجہ اور ہدفِ نگاہ بن جاتا ہے۔ وہ خدا کو ہر دم یاد کرتے ہیں اور اس طرح اپنے نفسوں کو، اپنی ہوا و ہوس کو، اپنی جہالت و حماقت کو فراموش کر دیتے ہیں۔ صورتِ خداوندی پر تخلیق ہونے کی وجہ سے ان میں تمام صفاتِ خداوندی ایک خاموش اور امکانی حالت میں موجود ہوتی ہیں۔ الحق پر توجہ مرکوز کر کے اور بے

حقیقت کو بھول کر انسان اصل میں اپنے آپ کی حقیقی جہت کو برباد کرتا ہے۔

مولانا روم نے ایک تمثیل کے وسیلے سے ہمیں یہ بتایا ہے کہ جب نفسِ انسانی اپنی اصل کو برباد کیا جاتا ہے تو کیا ہوتا ہے۔ انسان مرکب ہے روح و جسم کا۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے گدھے کی دم پر فرشتے کے پر لگا دیے ہیں۔ جب انسان اپنی ملکوتی اور خدائی صفات پر اپنے آپ کو مرکوز کر دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ سے وہ قوت عطا کر دیتے ہیں جس سے وہ حصولِ حق تک پرواز کر سکتا ہے اور اگر اپنے فرشتہ سرشت ہونے کو بھلا دے اور صرف اپنی حماریت ہی میں پھنسا رہے تو پھر اس کا ٹھکانا اصطبل ہے۔ اسی حوالے سے مولانا روم نے اکثر انسان کی مثال یوں دی ہے کہ انسان ہونے کا مطلب ہے کہ گویا سیدنا عیسیٰ خرِ عیسیٰ پر سوار ہوں۔ کہتے ہیں [49]

رحم بر عیسیٰ کن و بر خر مکن		طبع را بر عقلِ خود سرور مکن

اقلیمِ عشق Ethos of Love

ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ ”احسان“ کے مختلف مظاہر کا مرکزی نکتہ ہے عشق یا حب یا محبت۔ شاعری پر یہ بات خاص طور پر صادق آتی ہے کہ شاعری میں غالب موضوع محبت ہے اور اس کے بے شمار رنگ، استعارے اور تشبیہات ہیں۔ یہی بات تصوف کے لیے بھی درست کہی جا سکتی ہے کیونکہ تصوف میں عام طور پر محبت ہی کو سلوک طریقت اور حسنِ عمل کی کلید کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ بالفاظِ دیگر مسلمانوں کی اکثریت کے لیے محبت ہی وہ چیز ہے جس سے جسدِ اسلام کو زندگی اور تازگی نصیب ہوتی ہے۔ ان کے نقطۂ نظر سے محبت کی روحِ حیات آفریں نہ ہوتی تو اسلام کی تیسری جہت مفقود ہو جاتی؛ یعنی مرجھا کر خشک ہو جاتا ہے، اس کی رونق جاتی رہتی ہے اور دین کے نام پر لے دے کر ہمارے پاس یہ

تو جزئیات فقہ و تفصیلات عمل کی نذر بحثیں رہ جاتی ہیں یا مناظرے چپقلش اور یہ اس آدمی یا طبقے پر حملے کی غرض سے جو عقائد کے ضمن میں ہماری اعانت کی لکیر کا فقیر نہ ہو۔

وہ مسلمان جو اسلام کی تیسری جہت کو بہ طور مرکز بتاتے ہیں وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ایمان کی پرورش کے لیے شریعت ضروری ہے اور ایمان عمل کے ساتھ مل کر وہ زمین فراہم کرتا ہے جس میں "احسان" کے پھول کھلتے ہیں اور اسی سے احسان کی آبیاری ہوتی ہے۔ انسان کے لیے نہ ایمان سے کوئی گریز ہے نہ عمل سے مفر، احسان انہی کے دائرے میں اور انہی کے سہارے پنپ سکتا ہے۔ لیکن ایمان و عمل مقصود و بالذات نہیں ہیں۔ ان کا جواز وجود کچھ اور ہے۔ ایمان و عمل کو بار آور ہونا ہے، پھل پھول لانا ہے اور ایک لفظ میں کہیے تو ان کا پھل ہے محبت، حب الٰہی۔ مسلمانوں میں سے جو لوگ اس انداز میں سوچتے ہیں ان کے نقطہ نظر کو سمجھنا ہو تو محبت، عشق اور حب الٰہی کے بارے میں ان کے خیالات اور تصورات کو قدرے تفصیل سے دیکھنا ہوگا۔

شعر میں عشق خداوندی کی سب سے بڑی نمائندہ آواز مولانا روم کی ہے۔ مولانا روم ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ ایک طرف تو محبت کی تعریف متعین کرنا ناممکن کام ہے اور دوسری طرف اس کی لاتعداد تشریحات کی جا سکتی ہیں۔ ہم نہ یہ کہنے کے قابل ہیں کہ محبت اصل میں ہے کیا اور نہ ہی ہمیں بیان محبت کا کوئی کنارہ اور انتہا میسر آتا ہے۔ پھر بھی ہم مولانا روم اور دیگر صوفی مصنفین کی پیروی میں تگ و دو کر سکتے ہیں کہ عشق و محبت کے متعدد معنی کی کچھ پرتیں آپ کے سامنے کھول سکیں۔

ہم اس بات کی وضاحت کر چکے ہیں کہ محبت صفت خداوندی میں سے ایک ہے۔ بالفاظ دیگر اللہ تعالیٰ "الحب" ہے، محبت ہے۔ لیکن محبت اور رحمت الگ

لگتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت عامہ ہر مخلوق کے لیے ہے جبکہ اس کی رحمت خاص جنت میں ظاہر ہوتی ہے اور اہل تقویٰ کو نصیب ہوتی ہے۔ اللہ کی رحمت خاص کا الٹ ہے غضب خداوندی اور عذاب خداوندی کا سب سے صاف اور واضح عکس ہے دوزخ۔ قرآن مجید کے مطابق محبت کا تعلق اللہ کی رحمت خاص سے ہے۔ رحمت عام سے نہیں۔ اللہ تعالیٰ کو اہل احسان سے، محسنین سے محبت ہے، منکرین حق اور اعمال قبیحہ کے مرتکب لوگوں سے نہیں۔ اگر ان سے بھی محبت ہوتی تو ان کو دوزخ میں نہ ڈالا جاتا۔ اس سے اس بات کا انکار مقصود نہیں کہ اللہ کی رحمت اس کے غضب سے بڑھی ہوئی ہے اور خود جہنم ان لوگوں کے حق میں ایک رحمت ہے جو دوزخ کی نذر کیے جائیں گے۔ یہ ایک جداگانہ بحث ہے اور اس میں الجھ کر ہم محبت کے مسئلے سے بہت دور نکل جائیں گے۔

اہل تصوف میں جو حب خداوندی، عشق الٰہی پر اتنا زور دیا جاتا ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ ان کے ہاں تشبیہ کو تنزیہ پر ترجیح دی گئی ہے، رحمت کو غضب پر غالب رکھا گیا ہے۔ جب فقہا اور اہل کلام اللہ تعالیٰ کی بات کرتے ہیں اور اس کا ذکر اپنے معقولاتی سانچوں اور اوامر و نواہی کے مطابق کرتے ہیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہی ہے کہ انسان میں خوف اور دوری کا احساس پیدا ہو جائے۔ اس کے برعکس صوفیاء کے ہاں زور ہے اللہ کے قرب پر اور انسانوں کے لیے اس کی محبت پر۔ عقلی دلائل اور مجرد بحثوں کی بجائے اہل تصوف ہر طرح کی تشبیہات اور استعارات استعمال کرتے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ انسان کے لیے ایک واقعی اور زندہ تجربہ بن جائے۔ ان کے پیغام کی تہ میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سے محبت کرتے ہیں اور ہمارا بھلا چاہتے ہیں۔ اسی بات کو سمجھانے کے لیے وہ اللہ کی صفات حسنہ اور صفات تجلیہ کو روزمرہ کی زبان میں

بیان کرتے ہیں اور اسی پر زور دیتے ہیں۔ اگر کوئی آپ سے محبت کرے تو آپ بھی اسے چاہنے لگیں گے، یہ انسانی فطرت ہے۔ صوفیہ انسان کے اس نفسیاتی رجحان سے سب سے زیادہ آگاہ تھے۔ مزید برآں انہیں اس مابعد الطبیعاتی امر کا بھی پورا ادراک تھا کہ تخلیق آدم سے اللہ تعالیٰ کا مقصود یہی تھا کہ محبت کو صورت و تجلی مل جائے کیونکہ انسان کے سوا کوئی مخلوق صحیح معنوں میں اللہ سے محبت کی اہل نہیں۔

ان نکات کی تائید میں اہل تصوف کی کتابوں سے لاتعداد حوالے دیے جاسکتے ہیں۔ ان کی گنجائش یہاں میسر نہیں۔ صرف اتنا عرض کرنے پر اکتفا کریں گے کہ عالم اسلام میں حب الٰہی اور عشق خداوندی کے موضوع پر جو لکھا گیا ہے اسے اگر انگریزی میں دیکھنا ہو تو مولانا روم کی مختلف کتابوں کے تراجم کی صورت میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

ذیل میں ہم رشید الدین میبدی کی کشف الاسرار سے ایک اقتباس دے رہے ہیں۔ اس کا ترجمہ انگریزی میں بھی موجود نہیں۔ کشف الاسرار صوفیانہ ادب کی شاہکار کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ مغربی محققین نے اسے عموماً نظر انداز کیے رکھا ہے۔ مصنف کے بیان کے مطابق قرآن مجید کی یہ تفسیر موسوم بہ کشف الاسرار کی ابتدائے تصنیف ۵۲۰/۱۱۲۶ میں ہوئی۔ آج جو ایڈیشن ہمارے سامنے ہے اس کے آٹھ ہزار صفحات ہیں سو ہم یہ گمان کرنے میں حق بجانب ہیں کہ اس کی تکمیل میں کئی سال لگے ہوں گے۔ کشف الاسرار کا صرف ایک چوتھائی حصہ آیات قرآنی کی صوفیانہ تفسیر و تعبیر پر مشتمل ہے۔ باقی تمام متن یا تو قرآن کا فارسی ترجمہ ہے یا آیات کے ظاہری معنی، الفاظ کے دروبست، سیاق و سباق کلام، شان نزول اور تاریخی نکات کا بیان اور ان کی اہمیت کی شرح و توضیح۔ اس کے بعد

مصنف متنِ قرآن کے معنوی پہلوؤں کو اپنی توجہ کا مرکز بناتا ہے جو عام طور پر نظر میں نہیں آتے۔ ان مقامات پر وہ اکثر اپنے استاد، مشہور صوفی بزرگ اور فقیہ خواجہ عبداللہ انصاری ہروی (م ۴۸۱، ۱۰۸۸) کا حوالہ دیتے اور ان کے اقوال نقل کرتے ہیں۔ خواجہ انصاری کی شہرت ان کی عربی اور فارسی تصنیفات کی وجہ سے ہے۔ فارسی میں ان کی نثری تحریریں فارسی زبان کے خوبصورت ترین شاہکار اور شاعرانہ اسلوبِ نثر کے بہترین نمونوں میں شمار ہوتے ہیں۔ اسی لیے ان کا ترجمہ خاص طور پر مشکل ہے۔ خواجہ انصاری سے میبدی نے جو اقتباسات دیے ہیں ہم وہ سطورِ ذیل کے ترجمے میں شامل ہیں۔ ہماری کوشش یہ رہی ہے کہ ان کی تحریر کا آہنگ گرفت میں آ سکے۔ اس لیے ہم نے اس کے لیے شعری ترجمے کا اسلوب برتا ہے۔

یہاں مصنف اس آیت کی شرح و تفسیر کر رہے ہیں جن کا ہم سابقہ صفحات میں حوالہ دے چکے ہیں۔ یہ قرآن مجید کی وہ آیت ہے جس کا حوالہ "محبت" پر گفتگو کرتے ہوئے ہر بحث میں بکثرت دیکھنے میں آتا ہے

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِیْنِهٖ فَسَوْفَ یَاْتِی

اللّٰهُ بِقَوْمٍ یُّحِبُّهُمْ وَ یُحِبُّوْنَهٗ (۵: ۵۴)

اے ایمان والو! تم میں سے جو اپنے دین سے پھر جائے گا تو (اللہ) ان

کی جگہ ایسے لوگوں کو لے آئے گا جن سے وہ محبت کرے گا اور وہ

اس سے محبت کریں گے

میبدی کی عبارت درج ذیل ہے:[۱]

اے ایمان والو! تم میں سے جو اپنے دین سے پھر جائے

اس آیت میں جانے والوں کے لیے ایک اشارہ ہے اور آنے والوں کے

آئے گا جس سے اللہ محبت کرتا ہو گا اور وہ اس سے محبت کرتے ہوں گے"۔

پہلے اللہ نے اپنی محبت کا اثبات کیا پھر بندوں کی محبت کا تاکہ تم جان لو کہ جب تک اللہ بندے کو دوست نہیں بناتا بندہ دوست نہیں بنتا۔

پیر طریقت خواجہ عبداللہ انصاری کا قول ہے

دوستی کے آنسوؤں کو پونچھنے کی نشانی رضا ہے۔ دوستی کے پانی کو بڑھانے والی وفا ہے، دوستی کا تشنہ سارے کا سارا نور ہے، دوستی نے درخت کا میوہ سب کا سب سرور ہے۔ جو دونوں جہان سے الگ جا پڑے دوستی کی وجہ سے معذور ہے۔ جس سے دوست سے دوست کے سوا چاہنا ناپسند ہے۔ دوستی، دوستی رب سے شامل ہے، باقی جو ہے غرور وسواس ہے۔ "تعلیم و تسخیر" ایک نقش ہے عظیم اور ایک کاروبار ہے انوکھا جس نے آب و گل کو تماشائی دیا کہ دوستی حق کا قبلہ بن گیا اور وصل کے تیر کا ہدف اور مسافر کیوں نہ اترائے جبکہ اللہ کی راہ نزدیک ترین منزل محبت کی منزل ہے وہ درخت کہ ہمیشہ سرمستی کا پھل لاتا ہے دوستی ہے، وہ زمین کہ جس نرگس انس گاتی ہے دوستی ہے وہ ابر کہ ہمیشہ نور برساتا ہے دوستی ہے، وہ شراب کہ جس کا رنگ بھی شہد ہے دوستی ہے۔ وہ راہ کہ جس کی خاک کا ذرہ ذرہ مشک و عنبر ہے دوستی ہے۔ دوستی کی آتش نوری ہے اور دوستی کا داغ ابدی ہے۔

کیونکہ دوست کی دوستی میرا چمن اور میری سرشت ہے
میں سارے کا سارا دوست کا ہوں اور دوست کُل کا کُل میرا

دیکھو ساری دوستی کہاں تک ہے! ان دوستوں کا قصہ کتنا میٹھا ہے میدان دوستی دل جتنا فراخ ہے۔ اقلیم فردوس دوستی کے درخت کی ایک شاخ ہے۔ دوستی کی شراب

کوشش کرنے والا دیدار کی ضمانت رکھتا ہے۔ جو سچا ہے وہ اپنی مراد ضرور پا لیتا ہے۔

روحِ خداوندی

بات سے بات نکلتی ہے۔ ارکان خمسہ کی بحث سے ہم دور نکل آئے تاہم شریعت کے بارے میں ہم تین گفتگو کر چکے ہیں اور بتاتے ہوئے آ رہے ہیں کہ قارئین پر یہ واضح ہو جانا چاہیے کہ شرعی اعمال و عبادات اسلام کی بنیاد اور اس کے لازمی ترین عناصر میں سے ہیں۔ اعمال کیا ہیں؟ روح کی تجسیم، روح مجسم یعنی انسان وہ روح ہے جسے قالب مل گیا جسم فراہم ہو گیا۔ جسم و روح کا ملاپ نفس میں ہوتا ہے اور نفس روح بھی ہے اور بدن بھی۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ ہماری تجسیم، قالب میں آنے کا ٹوٹ تعلق اس بات سے ہے کہ ہم کون ہیں اور ہمارے جسم اور قالب کا ہمارے اقوال و اعمال سے ایسا گہرا تعلق ہے کہ ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

ایک مذہبی طرزِ فکر یہ بھی ہے جو جسم اور روح کو ایک دوسرے کی ضد اور ایک دوسرے سے مسلسل برسرِ پیکار عناصر کے طور پر دیکھتا ہے۔ اس کی عام مثالیں عیسائیت کے علاوہ اس کے بعد ابھرنے والے طرز ہائے فکر میں بھی جا بجا نظر آتی ہیں۔ عیسائیوں میں بھی یہ خیال آپ کو خاص عام ملے گا جس کے تحت ہر روحانی چیز اچھی ہے اور جسم سے متعلق ہر شے بری ہے اس لیے جسم کی ہر شے پر یا تو غلبہ حاصل کرنا چاہیے یا اس سے گریز اور فرار۔ اسی کی وجہ سے عیسائیت فکری فضا میں مطلب دوسری نہج کو چھونے لگا ہے اور ہر بات کو جسم کے پیمانے سے جانچا جاتا ہے اور یہ خیال سرے سے رد کر دیا گیا ہے کہ کوئی روحانی حقیقت ایسی بھی ہو سکتی ہے جو جسم کے بندھن سے آزاد ہو یا جسم کے زیر اثر نہ ہو۔

ہم عرض کر چکے ہیں کہ اسلام کا روایتی نقطہ نظر روح اور جسم دونوں کو نوع انسانی کے لیے ضروری اور اہم عناصر ترکیبی کے طور پر قبول کرتا ہے۔ روح زیادہ حقیقی ہے کیونکہ اس کا تعلق اس جانب سے ہے جو اشیاء کی ربانی جہت ہے، جسے اللہ نے خود جسم میں پھونکا ہے، یہ نفس رحمان ہے۔ تاہم انسان کا وجود بحیثیت انسان تا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اس کے پاس جسم نہ ہو۔ یہ ایک بہت اہم عقیدہ ہے کہ روح کا انحصار بدن پر ہے۔ قصۂ آدم اس نکتے کو واضح کرتا ہے پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنے دونوں ہاتھوں سے گل آدم کی صورت گری کی اور اس کے بعد اس پیکر آب و گل میں روح پھونک کر آدم کی تخلیق کی

ہستی انسانی کا روز مرہ نفس انسانی کی سطح پر وجود میں آتا ہے۔ یہاں روح کا خلق اور پیدائشی نور بدن کی تیرگی میں مل جاتا ہے۔ ہماری انفرادیت، یعنی انفرادی حیثیت، روح اور بدن ہر دو سے الگ نہیں کی جا سکتی اور یہی نفس کا مفہوم اور اس کی تعریف ہے۔ ہم نے نفس کو ان معنی میں برتا ہے۔ مسلمان ماہرین نفسیات کی تحریروں میں بالعموم اسے یوں بیان کیا گیا ہے کہ نفس وہ بچہ ہے جو ایک روحانی باپ اور جسمانی ماں کی اولاد ہے۔ نفس کا کمال اس چیز میں ہے کہ میراث پدری کو ورثہ مادری پر غلبہ حاصل ہو جائے یعنی یوں کہیے کہ آسمانی کا حکم زمین پر چلنے لگے، اور نورانی، ظلمانی پر حاوی ہو جائے۔

زمین پر خوشے تبھی اگاتی ہے جب آسمان سے روشنی اور پانی نصیب ہوتا ہے۔ عورت بچے کو تبھی جنم دیتی ہے جب مرد کی تخم ریزی میسر آتی ہے۔ رنگ اس وقت نکھرتے ہیں جب روشنی تاریکی میں جگمگاتی ہے۔ زمین اگر روشنی اور پانی قبول نہ کرے تو بانجھ رہ جاتی ہے۔ تاریکی اگر روشنی کا انکار کرے تو اس کے پاس

دکھانے، آشکار کرنے کو، پیچھے نہیں رہ جائے گا۔۲۴

یہ وہ تمثیلات ہیں جو مسلمان مصنفین استعمال کرتے ہیں، یہ بتانے کے لیے کہ نفس کے لیے لازم ہے کہ روح کی تاثیر کے سامنے سپر انداز ہو جائے ایسے ہی جیسے انسان کے لیے لازم ہے کہ اللہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دے۔ روح سے منہ موڑنا اور بدن پر سارا دھیان جمائے رکھنا ایسے ہی ہے جیسے روشنی سے دور ہو کے تاریکی میں ڈوبتے چلے جانا۔ نفس کی روشنی، اس کی نورانیت صفاتِ خداوندی کی رہین ہے اور اس کی تاریکی اس جسمانی قالب، اس پیکرِ آب و گل، کے باعث ہے جو اس کے لیے مطلقاً ضروری ہے ورنہ نور کے لیے کوئی جگہ، کوئی محلِ ظہور ہی میسر نہ ہوگا جہاں اس کی چمک اور تابندگی اپنا آپ ظاہر کر سکے۔ نفس کو نور کی تجسیم بھی کہا جا سکتا ہے اور اس تیرگی کا نام بھی دیا جا سکتا ہے جسے روحانیت مل گئی ہو۔

نفس کوئی جامد و ساکت شے نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی خلاقیت کے پہلو میں نفس لمحہ بہ لمحہ بدلتا رہتا ہے۔ ہر آن اسے نت نئی صورتوں کا سامنا رہتا ہے اور چونکہ روح ہر قید سے آزاد ہے لہٰذا اسی کے پرتو میں نفس کو بھی ایک اضافی آزادی اختیار حاصل رہتی ہے۔ ہر عمل، خاص طور پر ارادی عمل، کا ایک اثر ہوتا ہے اور اسی اثر سے یہ متعین ہوتا ہے کہ انسان کے اندر صورت لطیفہ کس انداز میں پیچیدگی کے عمل سے گزرے گی اور مضمر و پنہاں امکان سے بڑھ کر عیاں و آشکار حقیقت میں بدلے گی۔

نفس کی نشوونما اور ارتقا کا مبحث جس طرح زیرِ غور آتا رہا ہے اس میں سب سے عام طریقہ یہ ہے کہ اسے تین درجوں اور سطحوں کے لحاظ سے دیکھا جائے جنہیں عموماً "نفس امارہ" (برائی کروانے والا نفس)، "نفس لوامہ" (ملامت کرنے والا نفس) اور "نفس مطمئنہ" (وہ نفس جو اطمینان پا گیا) کے عنوانات سے یاد کیا گیا

ہے۔

پہلی قسم کو لیجیے۔ یہاں نفوسِ انسانی پہ اندر روح کا نور بہت کم پڑتے ہیں۔ ان میں غفلت اور نسیان کا، خود فراموشی اور خدا فراموشی کا میلان زیادہ کارفرما ہے، ہوا و ہوس کا حکم چلتا ہے، لوگ جو چاہتے ہیں کر گزرتے ہیں صرف اس لیے کہ ایسا کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ایک شیر خوار بچے کے لیے یہی صورت فطری ہے، اچھی ہے اور نارمل ہے۔ تاہم ہم میں سے ہر شخص اس بات سے آگاہ ہے کہ بچے کو رفتہ رفتہ یہ سکھانا لازم ہے کہ اس کی خواہشات سے بلندتر کچھ اور بھی فیصلہ کن عناصر ہیں جن کا حکم ماننا ضروری ہے لیکن تاوقتیکہ بچے میں عقل کا ملکہ پوری صحت سے نشوونما حاصل نہ کر لے اس پر عقلی دلائل برتنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

لیکن قرآن مجید کا خطاب بچوں سے نہیں ہے۔ اس کے مخاطب وہ عاقل و بالغ افراد ہیں جو اپنی فکری صلاحیتوں پر مکمل دسترس رکھتے ہوں۔ قرآن ان سے کہتا ہے کہ ہوا و ہوس کی پیروی بے عقلی کی بات ہے۔ یہ افراد صاحبِ عقل اور ذی عقل ہستیاں یہ جانتی ہیں کہ ان کے اپنے احساس و میلان سے بالاتر کچھ اور بھی ہے جس کا حکم ان کے انفرادی میلانات اور جذبات پر حاوی ہے۔ یہ درست ہے کہ قرآن مجید لوگوں میں اس نکتے کا فہم پیدا کرنے کے لیے منطقی استدلال اور فلسفیانہ دلائل و قال کا کوئی پروگرام مرحلہ وار خاکہ تجویز نہیں کرتا۔ یہ آج کی یونیورسٹی کے شعبہ فلسفہ کا کام تو ہو سکتا ہے لیکن اللہ کے لیے زیبا نہیں کہ وہ نوعِ انسانی کے تمام بالغ افراد سے خطاب کرنے کے لیے اس طرح کا اسلوب بیان اختیار کرے جو صرف ان لوگوں کے لیے موزوں ہو جنہیں فلسفہ طرازی کا شوق ہے۔ وحی کا مقصود لوگوں کو ہدایت فراہم کرنا ہے اور فلاح و مسرت کی ایک ایسی کیفیت تک رہنمائی کرنا ہے جس کا

تصور بھی اللہ کی مدد کے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَاءً بِمَا

كَانُوا يَعْمَلُونَ (۳۲: ۱۷)

تو کسی کو معلوم نہیں کہ ان لوگوں کے واسطے ان کے عمل کے صلہ میں

آنکھوں کی کیا ٹھنڈک چھپا رکھی ہے۔

مختصر یہ کہ قرآن مجید انسان سے خطاب کرتا ہے اور ان سے یہ کہتا ہے کہ اگر وہ بچوں کی طرح اپنی خواہشات کی غلامی کرتے رہیں گے اور ہوا و ہوس کے فرمان پر چلتے رہیں گے تو یہ ایک نہایت غلط بات ہوگی۔ صرف لغو ہی نہیں، اس میں بہت سے خطرات بھی ہیں کہ انجام کار یہ انہیں وہاں لے جائے گی کہ جس صورتِ لطیفہ پر انسان کو خلق کیا گیا تھا وہ ملیامیٹ ہو جائے گی۔ تاہم قرآن اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ سب نہیں، اکثر لوگ اسی سطح پر زندگی کرتے ہیں۔ حقیقت کی سماوی جہت سے بے توجہی اور غفلت مطلق تمام سوائے غول کو پیٹ میں لیے رکھتی ہے۔ انسان کی اس پست ترین حالت کو بیان کرنے کے لیے مسلمان ماہرین نفسیات نے قرآن کی اصطلاح "نفس امارہ" (۱۲:۵۳) استعمال کی ہے۔ یہ وہ مرحلہ ہے جہاں انکارِ حق اور غفلت شعاری انسان کو اپنی سرشت معلوم ہوتی ہے اور وہ ہر اس شے کو ٹھکرا کر ایک طرف پھینک دیتا ہے جو اس کی خواہش اور ہوائے نفس کے خلاف پڑتی ہو۔ نتیجہ کیا نکلے گا اس کی اسے کوئی پروا نہیں ہوتی۔ گدھے کی دم اور فرشتے کی پر کی جو تمثیل مولانا روم نے استعمال کی ہے اسے مد نظر رکھیں تو یوں کہنا ہوگا کہ یہ وہ مرحلہ ہے جہاں دم سے پر کو شکست ہو رہی ہے

ہمارے پاس یہ فرض کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ انسان اس مرحلے کو عبور

[illegible]

بچے جوں جوں بڑے ہوتے جاتے ہیں ان کا خاندان اور ماحول ان کے اندر عمل کرنے اور فیصلے تک پہنچنے کے معیار راسخ کرتا چلا جاتا ہے۔ عام طور پر یہ معیار اور جانچ پرکھ کے پیمانے ایک خارجی نوعیت رکھتے ہیں، چیزوں کو اچھے، برے اور صحیح یا غلط کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ مغربی تہذیب اگرچہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکی تاہم اس کی کوشش رہی ہے کہ وہ ان معیارات اور اقدار کو ایک عقلی اور سائنسی بنیاد فراہم کر دے۔ اسلام کا کہنا یہ ہے کہ یہی اقدار اور معیار تو خلقی اور پیدائشی ہوتے ہیں کیونکہ یہ ہمارے اندر کی صورت الہیہ سے جنم لیتے ہیں۔ بچے فطرت پر پیدا ہونے کے بارے میں ہم نے جو حدیث نقل کی تھی اس کے آخر میں یہ بھی ہیں "کل مولود یولد علی الفطرۃ فابواہ یہودانہ او ینصرانہ او یمجسانہ" (ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے والدین اس کو یہودی، نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں) آج کی زبان میں کہیے تو یوں ہوگا کہ "پھر اسے لادینی، سائنسی، انسان پرست، نیو ایج تحریک کا رکن وغیرہ وغیرہ بنا دیا جاتا ہے"

ہماری اقدار کا منبع کچھ بھی رہا ہو یہ بہرحال ہمارے ساتھ رہتی ہیں۔ انسانوں میں جو میلانات پائے جاتے ہیں ان کو چھوڑ کر قرآن مجید صرف ان لوگوں کو خطاب کرتا ہے جن میں اقدار کا کچھ پاس لحاظ ہوتا ہے۔ وہ ان کو ان کی سرشت و فطرت یاد دلاتا ہے اور بتاتا ہے کہ ان کی خلقت میں توحید کا اثبات موجود ہے۔ اسی یاد دہانی پر

کان دھرنے والے اللہ کو یاد کرتے ہیں، اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں اور شریعت پر عمل کرتے ہوئے احکامات خداوندی کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتے ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ نفس میں یک لخت روح کی روشنی سے چکا چوند ہو جائے گی۔ یا اسے حضور ربانی میں باریابی حاصل ہو جائے گی۔ اس کے برعکس ہوگا صرف اس قدر کہ انسان میں اب یہ آگہی پیدا ہو جائے گی کہ روح و جسم کے اس مرکب کی جسے نفس کہتے ہیں، عقلی اور روشن جہت زیادہ بنیادی ہے، زیادہ حقیقی ہے۔ روح کا خارج میں شکار بھی کیا جاتا ہے۔ اسے اب آپ نے تسلیم کر لیا ہے لیکن اس کی داخلی حقیقت کو بھی پوری طرح آپ کے لیے حقیقت میں ڈھلنا ہے۔

یہ نفس کا دوسرا مرحلہ ہے۔ مسلمان ماہرین نفسیات اسے "نفس لوامہ" کہتے ہیں (۷۵:۲) ضمیر اب بیدار ہے لیکن یہ ضمیر پیغام نبوی سے اخذ فیض کر رہا ہے۔ نشوونما کے اس مرحلے میں انسان احکام شرعی کی پابندی کرتا ہے جس قدر اس سے ممکن ہو۔ اس سے بڑھ کر وہ اپنے عمل میں اخلاص پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور ہر معاملے میں حسن عمل کے لیے کوشاں ہوتا ہے۔ فطری بات ہے کہ اس سے اکثر قرآن مجید کے مطلوبہ آدرش اور رسول خدا کی سنت کے مطابق زندگی بسر کرنے میں کوتاہی ہو جاتی ہے لیکن اب وہ شخص کندھے جھٹکا کے نہیں رہ جاتا گویا کوئی بات ہی نہ ہو۔ اس کے بجائے انسان خود کو ملامت کرتا ہے کہ اس نے خدا کے راستے میں زیادہ جدوجہد، زیادہ محنت کیوں نہیں کی۔ وہ خدا کے سامنے شرمندگی محسوس کرتا ہے کیونکہ وہ اس کی عبادت یوں نہیں کر پایا "گویا کہ دیکھ رہا ہو"۔ اسی سے نبی علیہ السلام کی اس حدیث کے ایک مفہوم کی طرف رہنمائی ہوتی ہے جس میں کہا گیا ہے

کہ "ہر دین کی ایک صفت ہوتی ہے اور اسلام کی صفت ہے، حیا"۲۳۔

اکثر اہل ایمان "نفس لوامہ" کے اس مرحلے کو مدت عمر عبور نہیں کر پاتے۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اگر وہ اس کمال تک رسائی حاصل نہیں کر سکے جو رسول خدا کی ذات میں مجسم نظر آتا ہے یا اسلامی روحانیت کے عظیم لوگوں کے برابر نہیں ہو سکے تو اس وجہ سے ان سب کو یکساں شمار کیا جائے۔ اہل ایمان میں سے ہر شخص نفس کی نشوونما کے ایک الگ درجے تک پہنچے گا۔ یوں دو نفوس ایک سے نہیں ہوتے اور خود نفس برابر متغیر اور انقلاب کی زد میں رہتا ہے۔ نفس لوامہ کے مرحلے میں زندگی کرنے کا مطلب ہے امید و بیم کے بیچ زندہ رہنا اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دینا کیونکہ خود آگاہی جب تک نہ ہو اپنے آپ کو ملامت کرنے کا مرحلہ آتا ہی نہیں۔ مولانا روم نے اپنے ایک مرید کو جواب دیتے ہوئے یہی نکتہ سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اس مرید کے اندر یہ دیکھ دیکھ کر اضطراب بھر چلا تھا کہ لوگ بالآخر اپنے منگول حکمرانوں کو کیسے والہانہ انداز میں تعظیم دینے پر مجبور ہیں۔ وہ منگول جو مسلمان بھی نہیں تھے

مرید نے کہا، "پچھلے وقتوں میں کافر لوگ بتوں کی پرستش کرتے تھے اور ان کے سامنے سجدہ کرتے تھے۔ آج ہم بھی یہی کر رہے ہیں۔ منگولوں کے سامنے جا کر ہم ان کے سامنے جھکتے ہیں اور ہر طرح ان کا عزت و احترام ظاہر کرتے ہیں۔ اس پر ہم خود کو مسلمان سمجھتے ہیں۔ یہی نہیں ہمارے اندر اور بھی بہت سے بت چھپے ہوئے ہیں، لالچ، حرص، ہوس، کینہ، کدورت اور حسد۔ ہم ان سب کے تابع ہیں۔ داخلی طور پر بھی اور خارج میں بھی ہم بت پرستوں کی سی حرکتیں کرتے ہیں لیکن خود کو مسلمان کہتے ہیں۔

مرشد نے جواب دیا۔ "لیکن ایک بات واضح ہے۔ تمہارے ذہن میں ایک بات آئی ہے کہ یہ چیز بری ہے اور اسے گوارا نہیں کرنا چاہیے۔ سو تمہارے دل کی آنکھ نے یقیناً کوئی ایسی شاندار، پر عظمت چیز دیکھی ہے جس کو نہ تم بیان کر سکتے ہو نہ اس کی تعریف کر پاتے ہو اور جو تمہیں یہ بتاتی ہے کہ یہ سب کچھ بہت قبیح اور شرمناک ہے۔ کھارا پانی اسی شخص کو کھارا محسوس ہوتا ہے جس نے آبِ شیریں چکھا ہو۔ چیزیں اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے ایمان کا نور تمہارے نفس میں ڈالا اور تمہارے نفس کو یہ چیزیں بری لگتی ہیں۔ اس نور کا حسن ہی تو ہے جس کی وجہ سے تمہیں یہ چیزیں قبیح محسوس ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دوسرے لوگوں کو ان اعمال سے کوئی اذیت نہیں ہوتی۔ وہ اپنے طرزِ عمل پر خوش ہیں اور کہتے ہیں کہ "یہی تو کرنے کی چیز ہے۔ تم جس شے کی جستجو کرتے ہو اللہ کی طرف سے وہی عطا ہوتی ہے۔ جس چیز کی آرزو کرو گے وہی بن جاؤ گے۔ پرندے کو اس کے پر ہوا کے دوش پر اٹھائے پھرتے ہیں۔ اور اہلِ ایمان کو ان کی آرزو پرواز عطا کرتی ہے۔"۴۴

ایمان والوں میں اپنی خرابیوں، کوتاہیوں کا ہر وقت احساس رہنا چاہیے اور ان پر غلبہ حاصل نہ کرنے پر خود کو ملامت ہونا چاہیے۔ دوسری جانب ان کے سامنے ایک ایسا مثالی نمونہ ہونا چاہیے جس کی طرح کا بننا ان کے لیے آرزو کی حیثیت ہو۔ اس تک پہنچنا تبھی ممکن ہو گا جب وہ کوشش کریں گے اور کوشش کرنے کے بعد وہ اس کے آدرش تک اپنی سعی و کوشش سے نہیں پہنچیں گے بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے وقت پر انہیں یہ منزل نصیب ہو جائے گی۔ مولانا روم اور ان کی طرح کے دیگر مصنفین ہمیں یہی بتاتے ہیں کہ خوش نصیب وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی رحمت اور مہربانی پر زور دیتے ہیں۔

نفس کا آخری مرحلہ "نفس مطمئنہ" کہلاتا ہے۔ اس کی بنیاد قرآن کی یہ آیت ہے

یا ایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ

(الفجر ۸۹: ۲۷-۳۰)

اے وہ نفس جس کا اطمینان (اپنے رب پر) جما رہا! چل اپنے رب کی طرف، تو اس سے خوش وہ تجھ سے راضی! شامل ہو جا میرے بندوں میں! اور داخل ہو جا میری جنت میں۔

یہ وہ نفس ہے جو اس دنیا میں اپنے رب کی طرف لوٹ گیا ہے۔ ایسے نفوس ان لوگوں کے ہوتے ہیں جو "احسان" کے اس درجے تک پہنچ جاتے ہیں جہاں وہ اللہ کی عبادت یوں نہیں کرتے "گویا" اسے دیکھ رہے ہوں بلکہ سچ مچ اسے ہر شے میں حاضر پاتے ہوئے، اپنے آپ میں بھی اور دنیا میں بھی۔ اہل تصوف کی نظر میں یہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام ہے جو اللہ کے پہلے بندے ہیں۔ اسی مقام کا پرتو باقی تمام انبیاء کا ہے اور ان سب لوگوں کا جنہیں اللہ تعالیٰ اس مقام کے لیے چن لیتے ہیں۔ یہی وہ آدرش ہے، وہ آدرش جس پر ہر مسلمان کی نگاہ جمی رہنا چاہیے اور جسے پانے کی اسے کوشش کرنا چاہیے

قرآن کا خطاب نہ تو نفس امارہ سے ہے نہ نفس مطمئنہ سے۔ نفس امارہ اندھا اور بہرا ہے اور نفس مطمئنہ اپنی منزل کو پہنچ کر روح کے نور میں پھر سے مدغم ہو چکا ہے۔ قرآن کا خطاب نفس لوامہ سے ہے جو دونوں اطراف، نور و ظلمت، خیر و شر اور درست و نادرست کے درمیان ڈولتا رہتا ہے۔ قرآن انسانوں کو یہ بتاتا ہے کہ وہ کہاں کھڑے ہیں، ایک ایسی دھندلی سی جگہ جو اللہ اور نیستی و عدم کے درمیان واقع

ہے اور پھر انسانوں کو وہ راستہ دکھاتا ہے جس پر چل کر وہ بے حقیقت چیزوں کی جگہ
حق کا منتخب کرتا ہے۔ جس حد تک ان کی آزادی حقیقی ہے اس حد تک وہ اپنے راہ
انتخاب کا چناؤ کر سکتے ہیں۔ اب انہیں یہ چننا ہے کہ فرشتے کا پر ان کو بلند ترین
آسمان تک اٹھا لے جائے گا یا گدھے کی دم انہیں گھسیٹ کر پست ترین زمین پر پہنچا
دے گی۔

خدا اور انسان کے بارے میں ساری اسلامی فکر یہی تصویر کشی کرتی ہے، ایک
ایسی مبہم حقیقت کی تصویر کشی جو وجود محض اور مکمل تیرگی کے درمیان جھول رہی ہو لیکن
یہ مبہم حقیقت کسی صورت بھی تجسیم سے بچ نہیں سکتی۔ حشر اجساد صرف اسلامی
عقیدہ ہی نہیں ہے یہ واحد طریقہ ہے جس سے اس بات کی توضیح ہو سکتی ہے کہ انسان
بیک وقت انسانی اور ربانی صفات سے مرکب ہے۔ صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے جو کسی
جسم سے متعلق نہیں ہے۔ انسان ہمیشہ کسی قالب اور جسم کا محتاج ہے

جسموں کے دوبارہ اٹھائے جانے یعنی حشر اجساد کا کسی طرح یہ مطلب نہیں لیا
جا سکتا کہ یہ مادی جسم ہمیشہ باقی رہے گا۔ ہر شخص جانتا ہے کہ یہ جسد فانی محض جسم
میں ڈھلی ہوئی روح یعنی نفس کی سواری ہے۔ نفس یعنی نقش و صورت میں ظاہر ہونے
والی روح کو ہمیشگی حاصل ہے مادی جسم کو نہیں۔ نفس خود ایک جسم بھی ہے اور روح
بھی۔ کبھی کبھار اسے اپنے جسم ہونے کی شناخت نہیں رہتی اور یہ خود کو صرف روح
خیال کرنے لگتا ہے لیکن عالم خواب اس کی خود فریبی کو تحلیل کر دیتا ہے۔ برزخ بھی
اس غلط فہمی کو دور کر دیتی ہے اور حشر، جنت اور جہنم بھی اس فریب سے نکالتی
ہیں۔ عالم برزخ ہو یا جنت جہنم ان میں سے ہر دنیا نفس کو ایک ایسے جہان
میں جلوہ گر ہونے کا تجربہ ہوتا ہے جو اس مادی جہان سے بالکل الگ ہوتا ہے جو اس

نے اس مادی دنیا میں اوڑھ رکھا تھا۔

ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ اسلامی نظری تعلیمات ان کی عملی تعلیمات کو سہارا بھی دیتی ہیں اور ان میں نکھار بھی لاتی ہیں۔ لیکن اگر یہ بات نظر میں رکھیے کہ نفس ایک ایسی حقیقت ہے جس کا ایک جسمانی قالب ہے تو عملی احکام و تعلیمات کو بنیادی اہمیت حاصل ہو جاتی ہے۔ یہ کوئی اتفاقی بات نہیں ہے کہ اسلام نے جہاں خود کو سب سے کھلے، واضح اور حتمی انداز میں پیش کیا ہے وہ شریعت کا میدان ہے۔ ارکان خمسہ کو ارکان یعنی ستون اسی لیے کہا جاتا ہے کہ ان کے بغیر دین کی عمارت استوار نہیں ہو سکتی۔ ارکان خمسہ نے جو اعمال و احکام مقرر کیے ہیں اور شریعت میں جو عمومی ہدایات دی گئی ہیں انہی کے وسیلے سے یہ ممکن ہوتا ہے کہ قرآن مجسم ہو جائے اور سچ مچ ہماری زندگی کا تجربہ بن جائے۔

(حصہ چہارم)

اسلام۔ تاریخ اور تصور تاریخ

باب نہم

تاریخ و تعبیر

اسلام کے روایتی تصورِ کائنات اور جدید مغربی تناظر کے مابین تاریخ کے فہم کے حوالے سے یقینی طور پر ایک گہرا فرق ہے۔ یہ عمیق ترین خلیج ہے جو ان کو ایک دوسرے سے جدا کرتی ہے۔ ان دونوں کے نقطہ ہائے نظر اور زاویہ نگاہ کا فرق سمجھنا ہو تو انگریزی میں تاریخ History کے لفظ پر غور کیجیے۔ اس کے معانی کے دو پہلو ہیں۔ ایک اعتبار سے تاریخ صرف واقعات کا بیان ہے۔ دوسری طرح دیکھیے تو تاریخ کو پس واقعہ دیکھنے اور شرح و توضیح سے الگ کرنا ممکن نہیں ہے۔

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ”یہ تو تاریخ ہے“ تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ ماضی میں کوئی واقعہ ہوا اور ہم اس سے آگاہ ہیں۔ اس اصطلاح کے استعمال میں مضمر یہ ہے کہ ماضی میں جو واقعات ہو گزرے وہ ایک معروضی حقیقت رکھتے ہیں اور ہم اس حقیقت سے باخبر ہیں۔ ماضی کے واقعات ہمارے لیے ایسے ہی ہیں جیسے مقامات و اماکن۔ ان کا ایک خارجی وجود ہے اور یہ غیر متغیر ہے۔

دوسرا نقطہ نظر ملحوظ ہو تو ”تاریخ“ کا لفظ استعمال کرتے ہوئے ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ مطالعہ تاریخ میں ایک موضوعی عنصر بھی شامل ہوتا ہے۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ ”تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے... تاریخ کا سبق یہ ہے...“ تو خود مضمر انداز میں ہی، ہم یہ بات کر چکے ہیں کہ ماضی کی معنویت تبھی واضح ہوتی ہے جب گزرے ہوئے وقت کا جائزہ کسی خاص تناظر میں لیا جائے۔ اس پر کسی طے شدہ زاویہ نگاہ نظر سے کی جائے۔ سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ آخر یہ وجہ ہے کہ ہم تاریخ

سے سبق الف کی جگہ سبق ج حاصل نہ کریں؟ یہ سوال کرتے ہی آپ کو احساس ہو جائے گا کہ مورخ حضرات، جن کا پیشہ ہی ادوارِ گذشتہ کی داستان رقم کرنا ہے، اپنے اپنے نقطۂ نظر، اپنے تعصبات، نظریات اور نظامِ فکر کے اسیر ہیں۔ ان کے اس چند مفروضات کو پہلے طے کر دیا گیا ہے اور ان کی بنیاد پر تجزیہ کیا جا رہا ہے۔ یہ چیز جتنی اہلِ تاریخ سے پیدا ہو سکتی ہے اسی قدر معاصر معاشرے، نفسیات یا مثلاً جراثیم bacteria کے مطالعے کے بارے میں بھی صادق آتی ہے جب ہم کسی چیز یا واقعے میں معانی کی جستجو کرتے ہیں تو اس کی بنیاد پہلے سے قائم کردہ کچھ آراء و خیالات پر ہوتی ہے ہم نے پہلے سے یہ طے کر رکھا ہوتا ہے کہ بامعنی ہونے کا مطلب کیا ہے۔ یہ نہ کیا جائے تو ہمارا حاصلِ عمل، بے جوڑ معلومات کے ایک ڈھیر کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔

دنیائے جدید میں ایک نئی چیز نے جنم لیا ہے۔ اسے تاریخ کا تنقیدی مطالعہ کہا جا سکتا ہے۔ ماضی کا مطالعہ کرنے کے جو نئے بہت سے طریقے وجود میں آ گئے ہیں ان سے کچھ اہلِ علم میں یہ خوش گمانی اور اعتماد پیدا ہو گیا ہے کہ انسان کو اب آخر یہ قدرت حاصل ہو گئی ہے کہ وہ پچھلے گزرے وقتوں کا معروضی اور غیر جذباتی تجزیہ کر سکے۔ اس نقطۂ نظر میں خوش خیالی کا جو عنصر چھپا ہوا ہے اسے دیکھنے کے لیے کسی تجربے کی ضرورت نہیں ہے اور یہی ہمیں ہوشیار و محتاط کرنے کے لیے بھی کافی ہونا چاہیے۔

آج کل اسی دنیا میں جو مسلمات اور منظم افکار چل رہے ہیں ان کی تحقیق کرنا یہاں بے محل ہوگا۔ ایک نکتے پر ہم بہت زور دینا چاہتے ہیں: مورخین اور بہت سے فلسفی اس خیال کے حامل ہیں کہ تاریخ کو ایک نہایت غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔

تاریخ کو یہ حیثیت و مرتبہ دینے کی مثال دنیا کی کسی تہذیب میں اس سے پہلے نہیں ملتی۔ اس حصے میں کتاب کی تحریر سے بھی ظاہر کی گئی ہے کہ تاریخ کو اس طرح پیش نظر اہمیت دینے کا تعلق یہودی، مسیحی روایت سے ہے۔ اس روایت کی اہمیت کی یہی ہے کہ تاریخ از خود ایک غیر معمولی اہمیت اختیار کر جاتی ہے۔ یہودیت کو دیگر پرانے ادیان کے مقابلے میں امتیازی حیثیت بڑی حد تک اسی امر سے حاصل ہوتی ہے کہ یہودیت میں تاریخی واقعات کو ایک خاص معنویت دی گئی ہے۔ یہودیت کے بعد عیسائیت آئی۔ اس کی بنیاد جس امر واقعہ پر رکھی گئی وہ تاریخ کے "اندر" تھا، تاریخ کا حصہ تھا، اس سے "باہر" اور ماورائے تاریخ نہیں۔ اس طرح تاریخ کے عمل کو ایک خاص حیثیت مل گئی۔

عہد جدید میں بہت سے مغربی دانشور اپنے دین و ایمان سے تو ہاتھ دھو بیٹھے ہیں لیکن اس کے باوجود چند عیسوی روایات سے ہنوز خود کو وابستہ کیے ہوئے ہیں ان میں تاریخ کو دی جانے کا رویہ بھی شامل ہے۔ ہیگل ایک ایسے مفکر کی شاندار مثال ہے جسے الوہیت اگر کہیں نظر آتی ہے تو صرف تاریخ کے عمل میں۔

یہ سب کہنے سے ہماری مراد یہ نہیں کہ تمام جدید مورخین ہیگل کے ماننے والے ہیں۔ تاہم ہمارا یہ خیال ضرور ہے کہ مورخین میں ایک رائے عام ہو چکی ہے۔ انہیں زعم ہے کہ وہ یہ دریافت کرنے پر قادر ہو گئے ہیں کہ ماضی میں "فی الحقیقت" کیا واقع ہوا تھا اور وہ اس سے نتائج بھی مرتب کر سکتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ گویا انہوں نے اپنے آپ کو غیب دانی کے ایک "چھوٹے" منصب پر فائز کر لیا ہے (یہ خیال چند سال پہلے تک بہت عام تھا گو آج اس میں خاصی کمی آ چکی ہے)۔ اس لحاظ سے دیکھیں تو مورخین ہمارے لیے ماضی کی معنویت جاری و متعین کرتے ہیں۔ یہ

حاضر سے پہلے گزرے ہوئے جو بھی واقعات تاریخ میں ثابت ہو چکے ہیں ان کی "نشانیاں" سمجھنے کی اہمیت صرف ذہنی کے حصے میں آتی ہے۔ اسلام کے عہد اولین اور اس زمانے کے معاشرے اور اس کے ماحول کی تاریخ پر جیسی نظر ایف ای پیٹرز کی ہے کم لوگوں کو ملی ہوگی۔ اسلام، عیسائیت اور یہودیت کے مذہبی متون کا ایک مجموعہ ترتیب دیتے ہوئے پیٹرز نے "غیب بینی" کے اس دعوے کی طرف ہماری توجہ مبذول کروائی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ اس قسم کے کسی منصب کا دعویٰ نہیں رکھتے لیکن دوسرے مورخین، جن کی جو تیغ پیٹرز کی عبارت سے عیاں ہے، اسی قسم کے ذہن سے کام کرتے ہیں۔ پیٹرز لکھتے ہیں:۲۵

(یہ کتاب مرتب کرتے ہوئے) میں نے صحیح اور غلط، مستند اور غیر مستند کے بارے میں فیصلے صادر کرنے سے تقریباً گریز ہی کیا ہے۔ یہ کتب اور متون، الہامی سمجھی جاتی ہوں یا دیگر کتب، دین کے بنیادی متن کے طور پر ہم تک پہنچی ہیں بنا بریں میری تالیف میں آپ کو نہ تو جولیس ولہاوزن اور اگناز گولڈ تسیہر کے انکشافات کی چھوٹ نظر آئے گی نہ رودولف بلٹمان اور جوزف شاخت یا جیکب نیوسنر اور پیٹریشیا کرون کے الہامی سچ کی گونج اور مسلسل دعوے کی۔۲۶

یہ چیز مورخین ہی سے خاص نہیں ہے وہ لوگ بھی یہ دعوے کرتے ہیں جن میں یہ مذہبی پیغمبری مظہر ہوتا ہے۔ اگر دین کا کام عمل صحیح کے لیے ہدایت اور رہنمائی فراہم کرنا ہے، فکر اور معیت خاص کی تلقین کرنا ہے تو انسانوں کا کیا ہوا ہر وہ کام مذہبی معنویت اختیار کر سکے گا جس کا تعلق انتخاب یا کسی ایک تعلیم سے ہوگا۔ عہد جدید کی علمی دنیا میں کتنے ہی شعبے ایسے ہیں، بالخصوص علوم طبیعی یا پھر سائنس، جو عوام کے لیے فکر و عمل کی راہیں متعین کرتے ہیں۔ ان کے انکشاف کو عوام الناس چپکے

صرف کسی کا دھیان نہیں گیا تھا۔ اعتراض کی بات تو اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کوئی مورخ کسی چیز یا واقعے کی معنویت دینی یا کائناتی حوالے سے بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے یا معنویت کی بنیاد ان امور پر رکھتا ہے جن سے مذہبی اور کائناتی نتائج مرتب ہوتے ہیں۔

تاریخ کے معنی کی تلاش، اس کی معنویت پر گفتگو کا مطلب صرف ایک ہے، یہ جاننا کہ انسان ہونے کے معنی کیا ہیں؟ بعض مورخین بھلے یہ اعلان کیا کریں کہ وہ تو صرف واقعات کی ترتیب و اندراج سے سروکار رکھتے ہیں لیکن آج کے زمانے اور موجودہ عہد میں اکثر کو یہ ماننا پڑتا ہے کہ معروضی تاریخ تو محض ایک واہمہ اور فریب ہے، کسی بھی واقعے کا بیان اس وقت تک ناممکن ہے جب تک اس کی معنویت کے بارے میں رائے قائم نہ کر لی جائے۔ ماضی بعید کے دور یا داستان سے عہد بہ عہد جو معلومات ہم تک منتقل ہوئی ہیں ان کے بارے میں بھی آرا اور فیصلے ہر ہر مرحلے پر کیے جاتے رہے ہیں۔ مورخین نے اپنے شدید اور لائق تحسین ہدف یہ مقرر کیا ہے کہ وہ شرح و تعبیر کے تہ در تہ انبار تلے سے اصل واقعہ برآمد کیا کریں اور روایت خبر زدہ کی زد سے بچ کر اصل واقعہ دیکھنے اور دکھانے کا فریضہ انجام دیں۔ لیکن اس سب کا مطلب صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ روایت خبر زدہ کی جگہ مورخین کی نظر زدہ تعبیر کو حاصل ہو جائے گی۔ مورخ اپنی شرح و تعبیر کا حاصل ہمارے سامنے رکھ دیتا ہے کہ تصورات و نظریات قائم کرنا اور شرح و ترجمانی ایک ہی چیز کے دو رخ ہیں۔

علمی دنیا میں آج جو ذہن کارفرما ہے اس میں خودستائی اور خود تحسینی کا عنصر اکثر غالب رہتا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ تاریخ پر نظر ڈالنے کے تمام غیر جدید اسالیب اور

اپنے طرز ہائے فکر سے ممکن اور جب زمانے کو یہ ذہن رد کر دیتا ہے۔ اس تردید اور انکار کا شکار خاص طور پر وہ اسالیب ہوتے ہیں جو دینی تہذیبوں میں پائے جاتے ہیں۔ برنس لی سیلون نے اسی نکتے کی طرف درج ذیل اقتباس میں اشارہ کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ تمام ادیان عام طور پر تاریخی واقعات کو انسانی عاقبت اور معاد کے حوالے سے معنویت کا حامل قرار دیتے ہیں

اکثر یہی ہوتا ہے کہ زمانے کے بارے میں ہمارا تاریخی تناظر ہمارے لیے آڑے آ جاتا ہے اور ہمارے معاصرین نے ہماری مشترکہ تاریخی صورتحال کی گتھی سلجھانے کے لیے جو حل پیش کیے ہوتے ہیں وہ بے معنی اور غیر متعلق ہو کر رہ جاتے ہیں۔ دنیا کے مآل و انجام کو اس نظر سے دیکھنے کی ہمیں تاب نہیں ہے کیونکہ اس تناظر میں تاریخ کی حیثیت اضافی ہو کر رہ جاتی ہے، وقت کا وہ طور کہ جس میں زر، زمین، محنت تجربہ اور سائنس کی صورت میں مادی ترقیوں کا ذخیرہ کرنے کی گنجائش پیدا ہوں گے۔[2]

اسلام اور ماضی کی تعبیر

مسلمانوں کو ماضی سے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے۔ دین اور دو گانہ اسلامی ماخذ قرآن اور سنت کے فہم کا تقاضا ہے کہ گزرے ہوئے واقعات کے اثر آثار زمانۂ حاضر میں انسانی زندگی کے لیے فیصلہ کن اہمیت حاصل ہونا چاہیے۔ بعض مسلمان علماء نے عہد گذشتہ کے واقعات کی جمع و تدوین کو اپنا ہنر قرار دیا خواہ قرآن اور رسول خدا سے ان کا کوئی براہ راست تعلق نہ ہو۔ "تاریخ مسلمانان" کے عنوان سے ان علماء نے آدم تا این دم کی تاریخ مرتب کی۔ تاریخ کی صنف میں مدون کی جانے والی دوسری نوع کی تحریروں کا یہاں مذکور نہیں۔

جدید مورخین نے اکثر مسلمان مورخین کی تحریروں کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا ہے۔ اس ضمن میں ان کا گھناؤنا طریقہ یہ رہا ہے کہ مصنف کی تحریر کو لے کر تاریخ کے شارح بیان کے لیے اس کے اختیار کردہ موقف اور نقطہ نظر کو متعین کیا، اس سے جنم لینے والے "بگاڑ اور تحریف" کو منتج کیا اور پھر اپنے منہاج تحقیق کی چھلنی میں سے چھان کر وہ چیزیں اٹھائیں جو ان کے لیے مفید مطلب ہو سکتی تھیں۔

اسلام میں انبیاء کی تاریخ قوموں کی تاریخ رقم کرنے سے ہمیں سردست دلچسپی نہیں ہے۔ ہم نے ذکر کر دیا کہ تاریخ قوموں کا بھی ایک کردار رہا ہے لیکن اس تذکرے سے غرض یہ تھی کہ ایک بات کی صراحت ہو جائے۔ علم تاریخ یا تاریخ بحیثیت شعبہ علم، یا اس کا جو بھی کسی زمانے میں عنوان رہا ہو، مسلمانوں کی اکثریت کثیرہ کے لیے اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ ماضی کے لیے ان کے طرز احساس کی تشکیل قرآن اور اس کے تصور کائنات سے ہوئی ہے۔ گزرے ہوئے زمانے میں واقع ہونے والا ہر واقعہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے۔ سو ماضی کی معنویت متعین ہو چکی، لوگوں کو اس کی تفصیلات کا علم بعد کو ہوتا رہے گا۔

دنیائے جدید میں آ کر بھی صورتحال میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں آئی۔ اکثر مورخین کی تحقیق اپنے آدرش سے پہلے ہی امکاناتِ معنی پر قدغن عائد کر دیتی ہے تاہم جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے تو یہ امر نہایت واضح ہے کہ معنویت کا انحصار نشانیوں اور آیات پر ہے اور آیات اور نشانیاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔ بالفاظ دیگر معنویت کا تعین "توحید" سے ہوتا ہے۔

قرآن مجید بار بار لوگوں کو متنبہ کرتا ہے کہ وہ ماضی سے سبق حاصل کریں۔ سابقہ صفحات میں ہم نے دیکھا کہ انبیاء اور رسولوں کا قرآن میں کتنا ذکر ہے۔

تقریباً ہر معاملے میں قرآن ان آزمائشوں اور تکالیف کا ذکر کرتا ہے جن میں سے خدا کے نبیوں کو گزرنا پڑا تھا۔ مقصود یہ بتانا ہے کہ انسان ذرا نہیں بدلا۔ اہل مکہ رسول اللہؐ سے ویسا ہی سلوک کر رہے تھے جو بنی اسرائیل نے اپنے نبیوں سے روا رکھا تھا۔ مزید برآں اس سے ایک اور بات واضح ہوتی ہے کہ یہ ایک عالمگیر اور عمومی معاملہ ہے۔ با الفاظ دیگر یوں کہیے کہ یہ صرف سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کا معاملہ نہیں ہے یہ ہر زمانے اور ہر جگہ کا مسئلہ رہا ہے۔ خدا اور اس کے پیغمبروں سے اعراض اور غفلت کا رویہ انسانوں کی سرشت کا حصہ ہے۔ اسلام کا نقطہ نظر یہ ہے کہ انسان تاریخ کی معنویت فراموش کرنے کا عادی ہے، اسے ہمیشہ یاد دلانا پڑتا ہے۔

قرآن نے صرف انبیاء کے قصوں ہی کو تاریخ میں دست قدرت کی کارکشائی کی علامت کے طور پر بیان نہیں کیا۔ گزرے وقتوں کی معلومات کا سارا ذخیرہ قرآن کے سامعین کے لیے آثار ماضی کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ بیتے ہوئے تمدن اور پرانی تہذیبوں کے کھنڈر بھی اللہ کی نشانیاں اور آیات ہیں "کل شیء ھالک الا وجھہ" (ہر شے مٹ رہی ہے سوائے رخ یار کے) انسانی تہذیبیں گریزپا اور بے ثبات ہیں۔ اصل حقیقت اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ زمانہ سب کچھ برباد کر دیتا ہے۔ وقت کی تخریب سے اللہ کی پناہ ڈھونڈنا چاہیے، انسانی ہاتھوں اور انسانی دماغ سے گھڑے ہوئے عارضی اور فنا پذیر سہاروں میں نہیں۔ قرآن نے تقریباً بیس مقامات پر اقوامِ گذشتہ کے انجام و عاقبت کا ذکر کیا ہے۔ اپنے پڑھنے والوں سے قرآن اس بات پر غور کرنے کو کہتا ہے کہ وہ دیکھیں کہ ماضی کی کتنی ہی تہذیبیں اور کتنی اقوامِ گذشتہ اللہ تعالیٰ نے اس لیے مٹا دیں، نیست و نابود کر دیں کہ وہ نافرمان و ظالم تھیں۔ اس ضمن میں قرآن نے "سیحوا فی الارض" (دنیا میں گھومتے پھرتے) کی ترغیب دی ہے

کے بعد اب حدیث جبرئیل کا آخری حصہ دیکھیے۔ حدیث کی عبارت کچھ یوں ہے:

پھر اس شخص نے پوچھا "مجھے قیامت کے بارے میں بتائیے۔" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس سے پوچھا جا رہا ہے وہ خود پوچھنے والے سے زیادہ نہیں جانتا۔"

اس نے کہا "مجھے اس کی نشانیاں بتا دیجیے۔" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کنیز اپنی مالکہ کو جنم دے گی اور تم دیکھو گے کہ جن کے پاؤں میں جوتا ہے نہ تن پر کپڑا، بھوکے ننگے اور بھیڑ بکریاں چرانے والے عمارتیں کھڑی کرنے کے لئے ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کریں گے۔"

ہم ذکر کر چکے ہیں کہ قرآن مجید کے مطابق یوم آخرت کے بارے میں صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں کہ قیامت کب آئے گی، اس کے بارے میں اگر کوئی شخص کچھ جاننے کا دعویٰ کرے تو وہ جھوٹا ہے۔ حدیث کے بیان سے بظاہر تو یہ لگتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جبرئیل علیہ السلام کے سوال کو قیامت کی گھڑی سے متعلق جانا کہ ان سے پوچھنے والے نے یہ سوال کیا ہے کہ قیامت کی ساعت کب واقع ہوگی؟ اسی لیے آپ نے جواب میں فرمایا کہ وہ اس کے بارے میں سائل سے زیادہ نہیں جانتے کہ اس کا خدا کے سوا کسی کو علم نہیں ہے۔ تاہم یہ ضروری نہیں کہ سوال کرنے والے کا مدعا قیامت کی گھڑی یا یوم آخرت کا وقت دریافت کرنا رہا ہوگا۔ آپ ﷺ کے جواب کی ایک معنویت اور بھی ہو سکتی ہے کیونکہ آپ ﷺ کو مذکورہ بالا مکالمے کے دوران بخوبی معلوم تھا کہ سوال کرنے والی ہستی کون ہے۔ آپ ﷺ کے جواب کو یوں بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ آپ ﷺ یہ فرما رہے ہوں کہ "اے جبرئیل، اس کے بارے میں جو تم جانتے ہو وہ میرے علم میں بھی ہے لیکن اس علم کو افشا کرنا نہ میرے لیے روا ہے

نہ تم سے کھول سکتے ہو۔ بس یہ ہے کہ میں جس پیامِ خداوندی کے پہنچانے کا مامور کیا گیا ہوں اس میں یہ راز کھولنے کی اجازت نہیں ہے۔"

قربِ قیامت کے آثار سے آنحضرتؐ اور آپؐ کے صحابہ کو خاص شغف تھا۔ اس موضوع سے سب کو بہت دلچسپی تھی۔ حدیث کی کتابوں میں رسولِ خداؐ کی بہت سی احادیث تفصیل سے نقل ہوئی ہیں جن کا تعلق قیامت اور آثارِ قیامت سے ہے اور ان میں وہ علامتیں اور نشانیاں بیان ہوئی ہیں جو قیامت کی گھڑی سے پہلے نمودار ہوں گی۔ قرآن میں آخرِ قیامت کے ہونے کا تذکرہ کیا گیا ہے، بعض مقامات میں تو ایسے واقعات کی خبر دی گئی ہے جو قیامت سے پہلے ظاہر ہوں گے۔ مثلاً دنیا کے ختم ہونے سے ذرا پہلے ایک جانور نمودار ہوگا

وَإِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ أَخْرَجْنَا لَهُمْ دَابَّةً مِّنَ الْأَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ أَنَّ النَّاسَ كَانُوا بِآيَاتِنَا لَا يُوقِنُونَ (۲۷:۸۲)

اور جب ان پر بات پوری ہو جائے گی تو ہم ان کے لیے زمین سے ایک جانور نکالیں گے جو ان سے باتیں کرے گا کہ لوگ ہماری آیات پر یقین نہیں کرتے تھے۔

ایک اور آیت میں خبر دی گئی ہے کہ یاجوج ماجوج کے وحشی قبائل کھلے چھوڑ دیئے جائیں گے اور وہ تباہی پھیلا دیں گے۔

حَتَّىٰ إِذَا فُتِحَتْ يَأْجُوجُ وَمَأْجُوجُ وَهُم مِّن كُلِّ حَدَبٍ يَنسِلُونَ وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَإِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ أَبْصَارُ الَّذِينَ كَفَرُوا يَا وَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِي غَفْلَةٍ مِّنْ هَٰذَا بَلْ كُنَّا

اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اہل امر کی

حدیث رسولؐ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں جس میں فرمایا "کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیتہ" (تم میں سے ہر شخص راعی ہے اور ہر کوئی اپنی رعیت کے لیے جوابدہ ہے) مالکن اور کنیز کے رشتے کی صحیح صورت تو یہ ہے کہ مالکن حکم دے اور لونڈی اس حکم پر عمل کرے (سماجی بندھن اور بھی ہیں لیکن سر دست ہمیں مذکورہ بالا تعلق پر گفتگو کرنا مقصود ہے)۔ یہاں رشتہ ماں اور بیٹی کا ہے۔ ماں جنم دیتی ہے، پالتی ہے، بیٹی اپنی ماں کی فرمانبردار رہتی ہے۔ اب اگر "لونڈی اپنی مالکن کو جنم دے" گی تو ماں خادمہ بن کر رہ جائے گی اور بیٹی مالکن کی جگہ لے لے گی۔ اب ہوگا یہ کہ سماجی تعلقات اور رشتوں کا درست نظام الٹ جائے گا۔ ایک گہرا عدم توازن اور انتشار سے دوری اس کا نتیجہ ہوگا۔ مسلمانوں کے شعور میں اس سنگینی کا اندازہ اس بات سے لگایئے کہ کتنی ہی آیات میں قرآن نے احترام والدین کو "توحید" کا پہلا عملی اطلاق قرار دیا ہے۔ اس کی جانب اوپر پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے۔ اگر ماں بیٹی کے رشتے میں بگاڑ پیدا ہو جائے اور اگر یہ رشتہ معاشرے کے سب سے بنیادی رشتوں کا نمائندہ ہے تو پھر دیگر سماجی تعلقات اور رشتے کا ذکر کیا، خود توحید کا رشتہ بھی پراگندگی کا شکار ہو جائے گا، دین اور انسانی معاشرہ ٹوٹ پھوٹ کر رہ جائے گا۔

حدیث میں رسول اللہؐ نے جو دوسری نشانی بیان کی ہے وہ بھی مادی قسمت اور ریاست ہی کی ایک اور مثال ہے۔ اسلام میں غربت بہت قابل احترام چیز کہی گئی ہے۔ آپؐ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ اس بندے سے محبت کرتے ہیں جو صاحب ایمان ہو، نادار ہو، پارسا ہو اور کنبے کا کفیل ہو"۳ لیکن حدیث جبرئیل میں جس طبقے کا

قریب تر ہو گیا ہے اور قیامت کی کتنی ہی نشانیاں ہم سب کے لیے کھل کر سامنے آ گئی ہیں۔ ایک اور بات بھی پکی ہے، دین نے جو کچھ انسانوں کو دیا تھا، وہ نظام، وہ دنیا اب، مذہب مسیح کے ساتھ ہی بحال ہو سکے گی۔ یہ یوں کہیے کہ ''اسلام'' ''ایمان'' اور ''احسان'' کو امر واقعہ بنانا، اس پر صحیح معنی میں عمل کرنا، فرد کے لیے بھی اور معاشرے میں بھی دشوار سے دشوار تر ہوتا جائے گا۔

باب دوم

عصرِ حاضر

اسلام پر کوئی سی تعارفی کتاب اٹھا لیجیے، اس میں آپ کو اسلام کی تاریخ، اس کی اشاعت اور اسلامی معاشرے کے قیام کی تفصیلات مل جائیں گی۔ عصرِ جدید میں اسلام کی صورتحال کا بیان بھی موجود ہوگا۔ مسلم ممالک کے سیاسی حالات اور آجکل کے مسائل پر جتنی کتابیں سامنے آئی ہیں ان کے مقابلے میں اسلامی تہذیب کے اوائل اور قرونِ سابقہ یا اسلام کی دینی تعلیمات پر لکھی جانے والی کتابوں کی تعداد کچھ بھی نہیں۔ یہاں ہم پہلے سے موجود تحریروں کی تکرار کا ارادہ نہیں رکھتے نہ ہمارا مقصود یہ ہے کہ زمانے میں اسلام اور اس کے مسائل کو یوں بنا کر پیش کریں جو آج کے معاصر انسان کے طرزِ احساس سے لگا کھاتا ہو۔ ہم تو صرف اس نکتے پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں کہ تاریخ کو خدا کی نشانیوں کے طور پر کیونکر دیکھا جا سکتا ہے اور تاریخ پر اس تناظر سے کیونکر نظر ڈالی جا سکتی ہے جو "توحید" پر مبنی تصورِ کائنات کے زیرِ اثر ہو۔ مدعا یہ ہے کہ اسلام جس نظر سے اپنے آپ کو دیکھتا ہے اسی نظر سے دیکھیے تو معاصر تاریخ کی کیا حیثیت متعین ہوتی ہے؟

ابھی چند سال پہلے تک مغرب کے لوگ یہ فرض کیے ہوئے تھے کہ ارتقا Progress ہستیٔ انسانی کا ایک حقیقی جزو ہے اور غیر مغربی دنیا کو اگر عہدِ حاضر میں اپنی بقا عزیز ہے تو اسے پیروی مغرب کرتے ہوئے اس کے نقشِ قدم پر چلنا ہوگا۔ بیسویں صدی میں انسان جن حالات سے دوچار ہو رہا ہے انہیں دیکھتے ہوئے سمجھ بوجھ والے انسانوں کی اکثریت اب شک میں پڑ گئی ہے کہ کیا ترقی واقعی ایک خیر کی چیز

ہے۔ اب بہت سے لوگ یہ سوال اٹھانے لگے ہیں کہ مغرب کے معاشرے نے
ٹیکنالوجی کی ترقی اور پیش رفت کا جو راستہ اختیار کیا ہے کیا یہ کوئی دانشمندی کی بات
تھی؟ کیا یہ انتخاب درست تھا؟ ہر میدان سے متعلق دانشمند اور ہر شعبۂ علم کے
ماہرین یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ارتقاء اور تقدم کی یہ راہ، جس پر آج کا انسان گامزن ہے
کہیں خودکشی کا قریب ترین اور تیز ترین راستہ تو نہیں؟

خود ارتقاء یا تقدم Progress کا لفظ بھی کتنے ہی سوالوں کو جنم دیتا ہے۔
اس کے لیے ایک سمت، ایک ہدف و مقصد اور اس کو ناپنے کا ایک پیمانہ اور پرکھنے کا
ایک معیار ہونا چاہیے۔ اس نظر سے انسانوں کے معاملات کا جائزہ لیجیے تو یہی لگتا
ہے کہ صرف ایک میدان ایسا ہے جس میں ارتقاء یا تقدم ہوا ہے اور اس سے انکار
نہیں کیا جا سکتا یعنی ٹیکنالوجی کے سہارے قوت و استیلاء کا حصول۔ ہمارے کمپیوٹر
اور ہمارے بم یقیناً پہلے سے بہت بڑھے ہوئے ہیں لیکن انسانی کاوشوں کا ہر دوسرا
شعبہ عملاً سنگین قسم کے شکوک کے نرغے میں ہے حتیٰ کہ وہ شعبے بھی جن میں عام طور پر
ارتقاء و تقدم کو مسلمہ حقیقت سمجھا جاتا ہے یعنی طب اور عمومی نوعیت کے سائنسی
علوم

اگر آپ نے تاریخ کے دھارے سے ابھرنے والی انسانی صورتحال پر نگاہ
متوازن ڈالی، یہ دیکھنے کی کوشش کی کہ تاریخ کے عمل میں خود انسان پر کیا گزری اور
ارتقاء کے بارے میں کیے جانے والے خوشحالی سے بھرپور دعوے معرض تشکیک
میں پڑے کیا ٹیکنالوجی کے سہارے حاصل ہونے والی رفتار اور قوت سے انسان
بہتر انسان بن جاتا ہے؟ کیا تیسری دنیا کے لوگوں کے مقابلے میں پہلی دنیا، ترقی
یافتہ دنیا کے باسی یا وہ پچھلے لوگ جو بیت گئے وقتوں میں زندگی گزارنے والے لوگوں

سے آج کے مغربی لوگ زیادہ اچھے انسان ہیں؟ یہاں آ کر ہمیں ایک معیار، ایک کسوٹی کی ضرورت پیش آتی ہے جس پر جانچ کر ہم آج کے انسانوں کے اچھے یا برے ہونے کا فیصلہ کر سکیں۔ لیکن عملاً ہوا یہ کہ جدید علمی دنیا میں طبعی علوم اور ٹھوس سائنس ہو یا سماجیات، نفسیات اور فلسفے کے میدانِ علم، یہ سبھی شعبے ایسے ہر معیار سے دستکش ہو چکے ہیں۔

عہدِ حاضر کے حالات کو ذرا کسی روایتی دین مثلاً اسلام کے نظامِ اقدار اور معیارِ خیر و شر کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھیے۔ فیصلہ آسان ہو جائے گا کہ "برہنہ پا عریاں بھوکے ننگے اور بھیڑ بکریاں چرانے والے عمارتیں کھڑی کرنے کی دوڑ میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش" کر رہے ہیں۔

یہ باتیں محض چونکانے کے لیے نہیں ہیں۔ ہم نے یہ سوالات اس لیے اٹھائے ہیں کہ قارئین ان مفروضات کے بارے میں غور کر سکیں جو تاریخ کی نوعیت، معاشرے اور انسانی فلاح و بہبود کے بارے میں صادر کیے گئے فیصلوں کی تہ میں کام کر رہے ہیں۔ جب ہم یہ اعلان کرتے ہیں کہ فلاں سیاسی سماجی ادارہ یا کوئی خاص واقعہ اچھا تھا یا برا، تو ہمارا یہ فیصلہ پہلے سے قائم کردہ ان خیالات کی بنیاد پر ہوتا ہے جو خود ہم پر بھی عیاں نہیں ہوتے۔ آج کی مسلم دنیا کے بارے میں کوئی رائے دینا ہو تو سب سے پہلے یہ بات واضح ہونا چاہیے کہ اسے جانچنے کا اصول اور پیمانہ کیا ہے۔ اکثر کتابوں میں اس چیز کا لحاظ نہیں رکھا جاتا بالخصوص وہ کتب جن کا موضوع حالاتِ حاضرہ وغیرہ ہو ان میں تو انسانی زندگی کے مقصد کے حوالے سے چلتے ہوئے آراء و تعصبات ہی کو بلا حیل و حجت فیصلہ کرنے کی بنیاد بنایا جاتا ہے۔ ارتقاء یا تقدم Progress ایک اچھی چیز ہے، یہ اور ایسے ہی بہت سے ان کہے مفروضات کا

ایک نمونہ ہے جنہیں لوگ باگ بے جانے بوجھے مانتے چلے جا رہے ہیں۔

اسبابِ زوال

مغربی اہل علم نے تاریخ اسلام کا مطالعہ عروج و زوال کی ایک داستان کے طور پر کیا ہے۔ اسلام کا "عہد زریں" عموماً وہ زمانہ قرار دیا جاتا ہے جو خلافت بغداد کے عروج کا دور تھا۔ مہذب دنیا کے بڑے حصے میں اسلام نقطۂ عروج و کمال کو پہنچ چکا تھا۔ سائنسی اور فلسفیانہ علوم، شعر و ادبیات اور فنون لطیفہ میں مسلمانوں کے کارنامے ان بلندیوں کو چھو رہے تھے کہ انسانی تاریخ میں اس سے قبل اس کی مثال ڈھونڈے سے نہ ملتی تھی۔ پھر رفتہ رفتہ مسلمانوں کی تخلیقی قوت کے انحطاط اور وحشی حملہ آوروں کی مسلسل یلغار نے اسلام کی خلاقیت کو زوال آشنا کر دیا۔ اٹھارویں صدی تک آتے آتے اسلام اس حالت کو پہنچ گیا کہ مغربی اقوام اس کو زیر کریں گے کیونکہ ان اقوام کے سائنسی اور ٹیکنالوجی پر مبنی انقلاب کا نئے زمانے میں آغاز ہو رہا تھا۔

یہ ہے وہ دانش مغرب جو اس موضوع پر عموماً سننے میں آتی رہی ہے۔ البتہ ادھر کے چند سالوں میں جو مورخین تحقیق کرتے رہے ہیں وہ اپنے پیشرو مصنفین کی ہر تحریر، ہر روایت اور بنیادیات کے بارے میں سوالات اٹھا رہے ہیں۔ مثال کے طور پر یہی دیکھیے کہ زوال کا تصور، نظریۂ ارتقاء و تقدم Progress سے جڑا ہوا ہے۔ مگر آپ ارتقاء کے اس مفروضے کو ہٹا دیجیے تو وہی چیز جسے زوال کا نام دیا جاتا رہا ہے اب ایک پرسکون توازن، اعتدال اور میانہ روی معلوم ہونے لگے گا جو تہذیب انسانی کے حصول مقاصد میں نہایت درجہ مددگار و مفید ہوتا ہے۔ اسلامی تہذیب نے کبھی بھی سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کو اپنا مقصود اصلی اور ہدف قرار نہیں دیا۔ اس کا مطمع نظر اور آدرش نفس انسانی کے درجہ کمال کا حصول ہے۔ اسلامی تہذیب

اپنے ہی مقرر کردہ معیار پر کس حد تک پوری اتری؟ اپنے نظام اقدار کے حوالے سے اس کی کیا حیثیت متعین ہوتی ہے؟ یہ وہ سوالات ہیں جن پر شاید چند ہی مورخین نے کبھی قلم اٹھایا ہو۔

بیسویں صدی آدھی ادھر آدھی اُدھر تھی کہ اسلامی ممالک میں مغربی تعلیم یافتہ دانشور طبقہ ابھرنا شروع ہوا۔ اس دور سے لے کر آج تک ان کے اثرات بڑھتے ہی رہے ہیں۔ مسلمانوں کا یہ طبقہ جدید نظام ہائے افکار، مغرب کی آئیڈیالوجی اور فکری مفروضات و مسلمات سے چونکہ بخوبی آگاہ تھا لہٰذا ان کے ہاں ہمیں اسلامی دنیا کی صورت حال کے بارے میں طرح طرح کے موقف اور آرا ملتی ہیں۔ مغرب کی استعماری قوتوں کے غلبے کے مقابلے میں مغربی طرز کی تعلیم حاصل کرنے والے مسلمانوں کا پہلا ردعمل تو ایک شدید احساس کمتری کا تھا۔ ان قوتوں کو یہ غلبہ ٹیکنالوجی کے زور پر حاصل ہوا تھا۔ مسلمان استعماری قوتوں کے غلبے سے اپنے ممالک کو آزاد کروانا چاہتے تھے۔ اس کے لیے جدید تعلیم یافتہ طبقات کو ایک ہی ممکنہ راہ سوجھی اور وہ یہ کہ جدید سائنس اور ٹیکنالوجی سیکھی جائے تاکہ اس کے سہارے سیاسی قوت حاصل ہو سکے۔ بہت سے مسلمان کچھ یوں سوچنے لگے کہ روایتی اسلام ان مقاصد کے حصول کے راستے میں ایک رکاوٹ ہے چنانچہ یہاں سے دو بنیادی رویے پیدا ہوئے۔ دو راہیں ایک دوسرے سے الگ ہو گئیں۔ کچھ لوگوں نے دین کو خیرباد کہہ دیا، باقی حضرات اصلاح دین میں لگ گئے۔

وہ لوگ جو ترک اسلام کر چکے ان سے ہمیں سروکار نہیں لیکن وہ لوگ جو اصلاح دین کی مہم پر نکلے تھے ان کے بارے میں ہم یہ جاننا چاہیں گے کہ وہ دین کی

اصلاح اپنے اپنے خیالات اور تصورات کے مطابق کرنا چاہتے تھے اور ان تصورات کی بنیاد اس سوال پر تھی کہ ایک ایسے دور میں سیاسی آزادی کیونکر حاصل ہو جس میں ارتکازِ قوت ان ہاتھوں میں ہو چکا ہو جو ٹیکنالوجی میں زور آور اور زبردست ہیں؟

اسلام میں اصلاحِ دین کے قائل حضرات ہمیشہ اسلامی تعلیمات کی ان جہات پر زور دیتے اور انہی کو نمایاں کرتے ہیں جن کو جدید سائنس اور ٹیکنالوجی سے ہم آہنگ کر کے دکھایا جا سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ کہ ان مصلحین کے ہاں عقلیت پرستی اور معقولات rationality پر زور ہوتا ہے اور کشف و تخیل کو بے وقعت بتایا جاتا ہے۔ اس گروہ کے مصنفین کی معذرت خواہانہ تحریریں انگریزی میں بھی انیسویں صدی کے ہندوستان میں سامنے آنے لگی تھیں۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے اور یہ لکھنے والے یہ اعلان کرتے نہیں تھکتے کہ اسلام نہایت عقلی، سائنسی اور شائستہ متمدن دین ہے۔ ان کے پیغام اور ان کے اعلانات کا اگر خلاصہ کیجیے تو کچھ یوں ہو گا

جدید سائنس نے جو کچھ کیا ہے وہ قرآنی تعلیمات سے منطقی نشوونما ہی سے عبارت ہے۔ انسانی قدر کی سطح پر دیکھیے تو اقوامِ متحدہ کا چارٹر قرآن و حدیث سے چرایا گیا ہے۔ بیرونی اثرات اور اندرونی زوال کی وجہ سے مسلمانوں نے قرآنی تعلیمات کے اصل ہدف کو فراموش کر دیا۔ قرآن کا مقصود تھا ٹیکنالوجی کی ترقی اور جمہوری معاشرے کا قیام (یہاں اگلی نمونہ ہی اقوامِ متحدہ) جب مسلمان اس سے غافل ہوئے تو اہلِ مغرب نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور مسلمانوں کا پیدائشی حق ان سے چھین کر لے گئے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ اسلام اپنی میراث دوبارہ حاصل کرے۔ (الزام دیا جا سکتا ہے کہ اصلاح پسندوں کی منطق کا یہ نقشہ کھینچتے ہوئے ہم

نے کسی حد تک مبالغہ کر کے اسے کافی سوپ پہنچایا ہے لیکن اس میں بڑی حد تک حقیقت پائی جاتی ہے۔)

اس طرح کی سوچ کا حاصل کیا تھا۔ یہ دیکھنے کے لیے دور جانے کی ضرورت نہیں۔ مغربی تعلیم کے سانچے میں ڈھلے ہوئے طبقۂ خواص اسلامی ممالک میں زمامِ اقتدار سنبھالے ہوئے ہیں۔ مختلف اسباب کی بنا پر ان سب نے مغرب کی نقالی شروع کر دی۔ آج بھی ''اسلامی'' تقاضوں کا سامنا اور ٹیکنالوجی پر سے ان کا اعتقاد کم نہیں ہوا۔ انہیں خوب معلوم ہے کہ سیاسی قوت کا لازمہ ہے کہ عوام کو ٹیکنالوجی کے بل پر زیردست رکھا جائے سو ٹیکنالوجی کی طاقت حاصل کرنے اور پھر اس کا جواز پیدا کرنے کے لیے وہ ہر طرح کی دلیل لاتے ہیں، قرآن و حدیث کے حوالے بھی اس ضمن میں لاتے ہیں۔

آثار تاریخی پر ایک نظر

جدید دنیا میں سیاسی قوت نے جاہ آرزوؤں کے بارے میں ہم نے سطور ماقبل میں چند آثار ظاہر کیے ہیں۔ ہم نے اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ ان میں سے کتنے ہی لوگ ایسے ہیں جنہیں صحیح اسلامی تعلیمات سے کوئی مس نہیں ہے۔ وہ طبقہ جسے ''بنیاد پرست'' Fundamentalist کا نام دیا گیا ہے وہ بھی اس تنقید سے دور نہیں ہے۔ اب ہم قارئین کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ آخر ہماری یہ رائے کیوں ہے کہ اسلام کی نگاہ میں جدید اسلامی تحریکیں ایک مشکوک چیز ہیں۔

اس کتاب کے آغاز ہی سے ہم یہ کہتے آئے ہیں کہ اسلام اپنے آپ کو جس نظر سے دیکھتا ہے اس کا تقاضا ہے کہ انسان اور اس کے معاملات کو ایک مختلف مگر

ایک دوسرے پر منحصر سطحوں کے حوالے سے زیرِ غور لایا جائے "اسلام" "ایمان" اور "احسان" (بندگی، ماننا اور حسنِ فکر و عمل) یا بالفاظِ دیگر عمل، علم اور نیت۔ اس نقطۂ نظر سے جائزہ لیجیے تو اسلامی تاریخ کی کیا تصویر ابھرتی ہے؟

اس سوال کا مفصل جواب دینے کے لیے تو ایک اور کتاب لکھنی ہوگی۔ یہاں ہم صرف بہت اختصار سے عرض کریں گے کہ معاصر تاریخ اور حالات کو پرکھنے کا کیا طریقہ ہونا چاہیے۔ اس سے قبل ایک نکتہ واضح کر دیں جو اسلام کے تصورِ کائنات کے حوالے سے ایک بدیہی چیز ہے۔ تاریخ میں صرف ایک وقت ایسا تھا جب ہستیِ انسانی کی تینوں جہات، ان تینوں پہلوؤں میں مکمل توازن پایا جاتا تھا اور یہ وہ زمانہ تھا جب مدینے کے مسلمان معاشرے پر رسولِ خدا ﷺ کی حکمرانی تھی۔ اس دور سے لے کر آج تک یہ نشیب و تنزل کا سفر ہے (جس میں گاہ گاہ ابھرتی اور تھمنے کے وقفے بھی آتے رہے ہیں) آپ ﷺ نے فرمایا:

تم پر آنے والا ہر وقت پہلے سے بدتر ہوگا، آج کے مقابلے میں آنے والا کل زیادہ شر لائے گا تا آنکہ تم اپنے رب سے جا ملو

مسلمان عام طور پر یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ خلافت کا دور یعنی مسلمان معاشرے کی سیاسی حکمرانی کا نظام بھی اس زمانے سے زوال آمادہ ہے جب سے موروثی خلافت کا دور دورہ ہوا۔ یعنی پہلی/ساتویں صدی میں خلافتِ بنو امیہ کے وقت سے۔ پہلے چار خلفاء کو اسلامی روایت "خلفائے راشدین" کے نام سے یاد کرتی ہے اس کا انگریزی ترجمہ rightly guided caliphs کیا جاتا ہے۔ ایک بہتر ترجمانی یوں ہو سکتی ہے اگر انہیں caliphs of moral integrity کا عنوان دیا جائے۔ اسلامی سیاسی اقتدار بنو امیہ اور بنو عباس کی

خلافت کے ساتھ عروج کی طرف مائل رہی لیکن مسلمان معاشرے کی دینی حالت وراں کی رہبری کرتے رہے۔ ہمارے متقدمین نے اخلاق کو بحیثیت مجموعی زوال و انحطاط کا متاثر دیکھنا پڑا۔ اہلِ اخلاص و صفا معاشرے کو ہر صدی، ہر زمانے میں اس زوال سے آگاہ کرتے رہے اور اصلاح پر توجہ دلاتے رہے۔ یہ پاک نفس لوگ اتنے تھے کہ شمار میں نہیں آتے۔ ابھی قریب کے زمانے تک اصلاحِ دین کا کام اسی تصورِ کائنات، اسی دید و دید، اسی تناظر اور سیاق و سباق میں کیا جاتا تھا جس کا بیان ہم اس کتاب میں کرتے آئے ہیں۔

روایتی نقطۂ نظر سے، معاشرے کی اصلاح فرد کی اصلاح پر منحصر ہے اور فرد کی اصلاح اس طرح ہوتی ہے کہ وہ اسلام کی تینوں جہات پر عمل کرنے والا بن جائے۔ فرد کا کمال ہمیشہ قربِ خداوندی سے متعلق ہوتا ہے یا یوں کہیے کہ ہر شخص، ہر مسلمان اپنے تئیں عبداللہ بننے کے عمل سے گزرتا ہے۔ یہ تو صرف آج کے دورِ جدید میں دیکھنے میں آیا ہے کہ اصلاح کے نام پر انسان کی تشکیلِ نو کا ڈول ڈالا جائے اور اس کی صورت گری خدا کے نمونے پر نہیں بلکہ (مغربِ جدید کو الہام کیے جانے والے) فردیت، جمہوریت اور ارتقاء کے کسی نقشے کے مطابق کی جائے۔

اسلام آج بھی پوری طرح زندہ ہے لیکن یہ بات تو باہر سے دیکھنے والوں کی نظر میں بھی آسانی سے آ جاتی ہے کہ جو لوگ زور شور سے اسلام سے اپنی وابستگی ظاہر کرتے ہیں ان میں بھی اسلام کی تین جہات یک توازن کے ساتھ موجود نہیں ہیں۔ یہ بات تقریباً بلا استثناء کہی جا سکتی ہے کہ وہ تمام گروہ جن کو بیرونی مبصرین نے بنیاد پرست کا نام دے رکھا ہے ان سب کا خاصہ ہے کہ ان کے ہاں شرعی احکامات پر تو بہت اصرار ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ خلوصِ نیت، اخلاق

رویوں اور روحانیت پر جو زور دینا چاہیے وہ مفقود ہوتا ہے۔ "اسلام" (بہ معنی حکایات ظاہر، قانونی حکایات) پر اس ڈھب سے بات کی جاتی ہے گویا یہی سارے کا سارا دین ہو اور "احسان" کے بارے میں اگر کبھی کچھ پوچھا بھی جاتا ہے تو اس کی حیثیت زبانی جمع خرچ سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اس کے ساتھ ہی جدید اسلام پسندوں کی سیاسی سرگرمیوں میں ایک ایسی غیر واقعی خیال پرستی Utopianism روح رواں کے طور پر کارفرما نظر آتی ہے جو تاریخ کی واقعی تفہیم سے سرتاسر متصادم ہے۔

ہم نے "اسلام" کو جس وسیع مفہوم میں متعارف کیا ہے اسے ملحوظ رکھیے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ انفرادی اور سماجی سطحوں پر یہ ایک قابل عمل نصب العین اور آدرش تھا اور آج بھی ہے۔ ہر فرد جو سچا مسلمان بننا چاہتا ہے اس کے لیے لازم ہے کہ شریعت پر پوری احتیاط سے عمل کرنے کی سعی کرے، اپنے "ایمان" میں گہرائی پیدا کرے اور ایسے اخلاقی اور انسانی فضائل virtues کی نمو کے لیے کوشاں رہے جن سے ایک متوازن انسانی شخصیت کی تشکیل ہوتی ہے ان فضائل میں حکمت، دانائی، صبر، شکر، فیاضی، کریمی اور عدل و محبت شامل ہیں۔ یہ تقاضے خاصے مشکل ہیں خصوصاً آج کی دنیا میں یہ دشواری اور بڑھ گئی ہے۔ پھر ان تمام پہلوؤں پر بیک وقت توجہ دینا تو بڑے جوکھم کا کام ہے۔

قرآنی سطح پر آخری مقصود و نصب العین یہ ہے کہ ایک متوازن اسلام پیدا کیا جائے جس سے ایک متوازن شخصیت جنم لے تو سماجی سطح پر آدرش ایک ایسے معاشرے کی تشکیل ہوگی جس میں سب عناصر باہم ہم آہنگی سے پنپتے فرائض انجام دے رہے ہوں۔ مسلمان اہل علم کو تصور اسلام سے [illegible] کا

درست تھا کہ ہر شخص دین کی تین جہات پر پورا اترنے کے قابل نہیں ہوتا۔ والدین قوم میں ہر نوع کی بالیدگی، حصول کمال اور انحراف کی حیرت کن صلاحیت پائی جاتی ہے۔ قرآن مجید نے زور دے کر فرمایا ہے

لا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا (۲:۲۸۶)

اللہ کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔

ہر فرد سے ہم یہ توقع نہیں رکھ سکتے کہ وہ اپنی زندگی کو علم حاصل کرنے یا روحانی معمولات و مشاغل کے لیے وقف کر دے گا۔ ہاں ہر شخص کو اپنی "وسعت" کے مطابق اس کے لیے کوشش ضرور کرنا چاہیے۔ ایک صحت مند اسلامی معاشرے کے افراد شریعت پر زیادہ سے زیادہ خلوص سے عمل کرتے ہیں، اسلامی علوم و فنون کی تحصیل کرتے ہیں اور اپنی اپنی استعداد کے مطابق روحانی زندگی کی سختیاں جھیلتے ہیں۔ ایسا معاشرہ اگر کبھی مکمل طور پر وجود میں آیا تھا تو دور نبوی میں۔ اس کے بعد سے اسلامی دنیا کے اکثر مسلمان معاشرے اس آدرش کو بس ایک حد تک ہی حاصل کرتے رہے ہیں۔ موجودہ دور سے پہلے تک تو ایسا ہی تھا۔

اگر مذکورہ وسیع معانی کو پیش نظر رکھیے تو باہر سے دیکھنے میں عالم اسلام کی صحت و سلامتی کا فیصلہ کرنا مشکل ہے تاہم بعض پیمانے اور معیار ایسے ہیں جن سے ایک تخمینہ لگایا جا سکتا ہے مثلاً سرکاری ہرکاروں یا حکومتی دباؤ کے بغیر شریعت کی پابندی، عقلی اور نقلی دونوں علوم کی ترویج و اشاعت نیز فن خطاطی، فن تعمیر، شعر و ادب اور موسیقی سے ابھرنے والا حسن و جمال۔

اسلامی اقدار کے زوال کی سب سے افسوسناک نشانیوں میں سے ایک اور

تعلیمات اپنی جگہ ایک چیز ہیں لیکن ان کی حیثیت ہمارے ہاں ہمیشہ ثانوی اور غیر اہم رہی ہے۔ سیاسی تعلیمات کو مرکزی حیثیت دینے کا مطلب ہے کہ "آپ اپنی روحانیت سے کٹ گئے ہیں۔" ہمارے زمانے کی اسلامی تحریکوں کے سیاسی منشور اور ان کی تہہ میں کارفرما آئیڈیالوجی کا اسلام کی تعلیمات سے شاذونادر ہی اساسی تعلق ہوتا ہے۔ ان کی جگہ ان میں قرآن وحدیث کی ایسی تعبیر ہوتی ہے جس کی بنیاد جمہوریت یا دوسری قسم کی "اچھی" طرزِ حکومت سے متعلق جدید مفروضات پر رکھی جاتی ہے۔ یہاں یہ تاثر ابھرتا ہے کہ جیسے اور ہر جگہ مارکسیت کا دور ختم ہونے لگا ہے اسلام کے جدیدیت زدہ حلقوں میں ابھی مارکسی تعبیرات کا رواج اٹھ چلا ہے۔

اسلامی جدیدیت اگر کبھی اسلام کے مکاتبِ فکر اور الٰہیات سے متعلق آرا کی طرف توجہ کرتی بھی ہے تو اس کی دلچسپی ان چند متکلمین اور فلسفیوں تک ہوتی ہے جو عقلیت پرستی میں سب سے زیادہ بڑھے ہوئے ہوں۔ عقلیت پرستی کو سائنس اور ٹیکنالوجی کے عشق سے ہم آہنگ کرنا آسان ہے۔ اس کے برعکس تخیل پرور اور حسبِ حال اور کشفِ حقائق کا ذکر فی الفور ایسے مسائل کو سامنے لے آتا ہے جن کا رابطہ انسانی فطرت سے ہے اور عصرِ جدید میں بہت کم لوگ ان مسائل کا سامنا کرنے کا یارا رکھتے ہیں۔

علم کلام یا بالخصوص معتزلی نوع کا علم کلام تو بہ سہولت اس سانچے میں ڈھل جاتا ہے جس میں جدید سائنس کے جواز سے اس کا ٹکراؤ نہیں رہتا۔ "تنزیہ" پر زور دینے میں متکلم کو آسانی یہ رہتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو مخصوص اور متعین صفات کے سوا ہر چیز سے مجرد قرار دے دیتا ہے۔ عقلِ جزئی کا کام ہی اللہ کو کائنات اور انسانی دنیا سے الگ کر کے دکھانا ہے۔ اس طرح علم کلام کے ماہر کو مستقل چھوٹ مل جاتی ہے کہ وہ

انسانی وجود کا ایک "عقلی" پروگرام مرتب کر کے پیش کر دے۔ اگر اللہ تعالیٰ کائنات میں حاضر و موجود نہیں ہے، جیسا کہ "تشبیہ" کا کہنا ہے تو پھر انسان آزاد ہے کہ روئے زمین سے جیسے چاہے معاملہ کرے۔ کوئی روک ٹوک، کوئی وجہ نہیں کہ ہم بھی عالم طبعی کے دریدہ بدن کو تاخت و تاراج کرنے میں مغرب کی تقلید نہ کریں۔ اور پھر وسیع پیمانے پر اقتصادی ترقی اور صنعتی آسودگی ہی خدا کا "پسندیدہ" راستہ قرار پائے جس پر چل کر وہ عقل پرست معاشرہ قائم ہوتا ہے جو "اسلام" کا "مقصود" ہے!

اسلام ایک عظیم مذہب ہے۔ اب تک کی گفتگو سے واضح ہو گیا ہو گا کہ "اسلام"، "ایمان" اور "احسان" کے متوازن اور ہم آہنگ امتزاج کا اب کچھ باقی نہیں رہا۔ ہر طرف بس انحراف ہی ہے۔ ایسے مسلمان ساری دنیا میں بکثرت موجود ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ اسلام کو تینوں سطحوں پر جیتا جاگتا رکھنا ضروری ہے۔ اگر ایسے لوگ منظر عام پر ظاہر نہیں ہوتے تو تعجب نہیں ہونا چاہیے۔ ہم سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ دنیائے جدید کی نگاہ میں اہم کیا ہے اور غیر اہم کیا اور ہم سب واقف ہیں اس امر سے کہ ریڈیو، ٹی وی اور جدید میڈیا شور و غل اور غوغا و فساد کا خوگر ہے، ہنگامہ و شورش ان کی ضرورت ہے۔ سکون و ثبات، اعتدال اور ہم آہنگی سے تو وہ خبریں، جنم نہیں لیتیں۔

مختصر فرہنگ

آدم

انسانِ اولین، نوعِ انسانی کے پہلے فرد یعنی انسان۔ اللہ تعالیٰ نے آدم کے جسم کو مٹی سے بنایا، اس سانچے میں اپنی روح پھونکی، اسے علم اسماء تعلیم کیا اور زمین میں اپنا خلیفہ مقرر کیا۔

آیت

نشانی، علامت۔ قرآن مجید میں یہ لفظ کائنات کی ہر چیز کے لیے مستعمل ہے جو خدا کی خبر دے خواہ مظاہرِ طبعی ہوں، انسانی معاملات ہوں یا دیگر مظاہر، صحائف خداوندی، انبیاء اور رسولوں سے ظاہر ہونے والے غیر معمولی اور معجزات، قرآن کی بھی آیتیں۔ آیت وہ اصطلاحی لفظ بھی ہے جس سے ہر سورت کے جزو کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

آیت اللہ

اللہ کی نشانی۔ کائنات کی ہر شے اللہ کی نشانی ہے۔ اس لفظ کا ایک مخصوص استعمال بھی ہے۔ ایران میں اس لفظ کو بیسویں صدی کے اوائل میں چوٹی کے علماء کے لقب کے طور پر اختیار کیا گیا تھا۔ آجکل سرکردہ مذہبی عالم کو ایران میں آیت اللہ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

اللہ

خدا کے لیے عربی لفظ/نام

امانت

وہ خاص ذمہ داری جو اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان اور کوہ و جبل کو عطا کرنا چاہی مگر وہ سب اس سے جھجک گئے اور انسان اسے اٹھانے پر تیار ہو گیا۔ امانت کو اکثر اوقات خلافت یا عبودیت کے مصداق بھی قرار دیا گیا ہے۔

عبد

بندہ، غلام، عبادت کرنے والا۔ کائنات کی ہر شے اللہ تعالیٰ کی ناگزیر بندگی میں ہے کیونکہ ہر شے اس کی مخلوق ہے۔ لیکن بنی آدم کو اللہ کی اختیاری بندگی بھی اختیار کرنا چاہیے کہ اس مقصد تک رسائی حاصل کر سکیں جس کے لیے ان کی تخلیق ہوئی ہے۔ "عبد" کا لفظ اکثر "خلیفہ" کے لفظ کے ساتھ بولا جاتا ہے۔

صحابہ Companions

وہ جن کی رسول خداؐ سے ملاقات ہوئی اور وہ آپ کے پیغام پر ایمان لائے۔

ذکر

تذکرہ کرنا، یاد آوری، یاد کرنا۔ لوگوں کو خدا کی یاد دلانا۔ نبیوں اور آسمانی کتابوں کا بنیادی فریضہ ہے۔ قرآن اس پر بیک ہے تو اسے بھی ذکر کہا جاتا ہے یعنی خدا کو یاد رکھنا اور خدا نے جو فرائض انسان پر عائد کیے ہیں ان کا دھیان رکھنا۔ خاص معنی میں عبادت کے ایک خاص انداز کو بھی ذکر کہا جاتا ہے جس میں عموماً اللہ تعالیٰ کے اسماء میں کچھ نام یا کچھ کلمات و صیغۂ ذکر بار بار دہرائے جاتے ہیں، مثلاً لا الٰہ الا اللہ۔

دُعا

عبادت کی وہ صورت جس میں انسان اللہ کے حضور اپنی شخصی حاجت پیش کرے اور استمداد و مناجات کرے۔

فطرت

انسان کی سرشت اصلی جس پر اللہ نے اسے تخلیق کیا۔ اس فطرت کا بنیادی خاصہ ہے توحید کا فہم۔

غفلت

بے پرواہی، انسان کی بنیادی کمزوری۔ ”ذکر“ کا الٹ

غیب

نادیدہ، غیر مرئی، غیر موجود۔ یہ اللہ تعالیٰ، فرشتوں اور جنات کی صفت ہے۔ عالم غیب اور عالم شہادت (نادیدہ دنیا اور مرئی دنیا) کائنات کی دو بڑی دنیائیں یا عالم ہیں۔

حدیث

رسول خدا کی یا آپ کے صحابہ کا قول جو آنحضرت کے عمل کے بارے میں ہو۔ حدیث کے مقابل قرآن ہے جو اللہ کا کلام ہے تو رسول خدا کا ادبی ہے۔ احادیث بہت سے مجموعوں کی صورت میں لکھی گئی ہیں۔ سنی اسلام میں چھ مجموعوں کو سب سے زیادہ قابل اعتبار اور درست مانا جاتا ہے۔ انہیں 'صحاح' (صحیح کی جمع) کا نام دیا گیا ہے اور ان کے مرتب کرنے والے علماء کے نام سے موسوم کیا گیا ہے جیسے صحیح

بخاری، صحیح مسلم، صحیح ترمذی، ابوداؤد وغیرہ۔

حدیث قدسی

قول مقدس۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیث جس میں قول باخداوندی کو صیغۂ واحد متکلم میں بیان کیا گیا ہو۔ مثال کے طور پر آنحضرتؐ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ نے اپنے عرش پر لکھ دیا ہے، رحمتی سبقت علی غضبی، (میری رحمت میرے غضب سے بڑھی ہوئی ہے)۔ دوسری احادیث کی طرح احادیث قدسی بھی قرآن سے الگ چیز ہیں۔

حج

مکہ کا سفر زیارت جو ہر صاحب استطاعت مسلمان پر زندگی میں ایک مرتبہ فرض کیا گیا ہے۔ اسلام کے پانچ ارکان میں سے ایک۔

حلال

جس کی شریعت کے حکم کے مطابق اجازت ہو۔ حرام کا متضاد۔

حرام

جو شریعت میں ممنوع کیا گیا ہو۔ حلال اور واجب کا متضاد۔

ہجرت

سنہ ۶۲۲ میں رسول خداؐ کا مکہ سے مدینہ تشریف لے جانا۔ یہ تاریخ اسلام میں اہم واقعہ تھا اتنا اہم تھا کہ اس سے اسلامی تقویم کا حساب آغاز شمار کیا جاتا ہے۔

تنزیہ

اپنی مخلوق کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کا بے ہمتا ہونا، بے مثل ہونا، اللہ کا بے چگوں و بے چوں ہونا، اس کی ماورائیت۔ تشبیہ کا تکملہ۔

تقویٰ

خدا خوفی، اللہ سے ڈرنا۔ قرآن میں بیان کردہ سب سے زیادہ پسندیدہ انسانی صفات میں سے ایک۔ "احسان" سے اس کا گہرا تعلق ہے۔

طریقت

لفظی معنی راستہ۔ وہ راستہ جو آج ور جعی اللہ کے روبرو کرتا ہے۔ طریقت کو وہ تنگ راستہ کہا جاتا ہے جس پر نسبتاً کم لوگ چلتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں شریعت وہ فراخ راستہ ہے جس پر ہر مسلمان کو چلنا ہوتا ہے بشمول ان لوگوں کے جو راہ طریقت کے مسافر ہوتے ہیں۔ صوفیاء کے سلسلے اپنے آپ "طریقہ" کہتے ہیں کیونکہ تصوف میں اسلام کی تینوں جہات کو عمل میں لانے کی سعی کی جاتی ہے صرف شریعت ہی پر عمل نہیں ہوتا۔

تشبیہ

اللہ کی اپنی مخلوق سے مشابہت، مخلوق کا اللہ کی مثال پر ہونا، مخلوق میں اس کا اثر و تاثیر، مخلوق میں حاضر و موجود ہونا۔ تنزیہ کا تکملہ۔

توحید

لفظی معنی ایک ہونے کی علامت، ایک کہنا، بتانا۔ اللہ کی وحدت کا اثبات، جو

ایمان کا پہلا اصول، اسلام کا بنیادی تصور کی خبر لی ہے۔ اس کا منطقی بیان سب سے زیادہ بہتر اسے کلمہ شہادت کے پہلے جزو میں کیا گیا ہے۔ توحید کامل وہ ہے جس میں "تنزیہ" اور "تشبیہ" کا بیک آن ثابت کیا جائے۔

عبادت

بندگی کرنا، عبد اور بندہ ہونا، پرستش کرنا۔ یہ انسان کا بنیادی فریضہ ہے۔ اس سے قاصر رہنے والے خلافت کے حقدار نہیں ہو سکتے۔

ابلیس

شیطان کا اسم معرفہ۔ دوسرے جنات کی مانند سے بھی آگ سے تخلیق کیا گیا تھا۔ اپنی عبادت اور نیکوکاری کے سبب سے فرشتوں میں یا قرب خداوندی نصیب ہو گیا تھا جب اللہ نے اسے آدم کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا تو اس نے اس کے انکار کر دیا سو اسے راندہ درگاہ بنا کر حضور حق سے نکال دیا گیا۔

احسان

حسن عمل، وہ کرنا جو خوبصورت ہو اور اچھا۔ اسلام کی تیسری جہت۔

امام

راہبر۔ رہنما۔ نماز باجماعت میں قیادت کرنے والا شخص۔ مسجد میں نماز پڑھانے والا۔ شیعہ حضرات کے ہاں رسول خدا ؐ کے خلفاء میں سے کچھ اکابر کو امام مانا جاتا ہے اور انہیں مسلمانوں کا جائز پیشوا اور راہبر تسلیم کیا جاتا ہے۔

ایمان

اسلام کی دوسری جہت۔ ایمان کا موضوع ہے، خدا، فرشتے، وحی اور آسمانی صحیفے، نبوت و رسالت، یوم آخر اور جزا و سزا۔ عموماً انہیں تین عنوانوں یعنی توحید، نبوت اور معاد کے تحت زیر بحث لایا جاتا ہے۔ ایمان کا متضاد ہے کفر۔

اسلام

اللہ کی بندگی، اطاعت اور فرمانبرداری۔ اس لفظ کے چار بنیادی معنی ہیں۔ سب سے پہلے وسیع معنی میں اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر مخلوق اللہ کی مطیع اور اس کے سامنے سرافگندہ ہے کیونکہ وہ اسی کی ذات کے دست قدرت سے وجود پاتی ہے۔ یہاں اختیار کا معاملہ ہی نہیں لیکن اس کے علاوہ اس لفظ کے جو تین معانی ہیں ان میں لوگ اسلام قبول کرتے بھی ہیں اور اس سے منکر بھی ہو جاتے ہیں۔ 'اسلام' کے دوسرے معنی ہیں انبیاء کے ذریعے آنے والی ہدایت خداوندی کے آگے سر تسلیم خم کرنا، اسے مان کر قبول کر لینا۔ تیسرا مفہوم وہ ہے جس کے لیے "اسلام" بطور نام معروف کے بولا جاتا ہے اس کا مطلب ہے وہ ہدایت خداوندی قبول کرنا جو قرآن سے عطا کی گئی ہے چوتھا مفہوم سب سے محدود اور خاص ہے۔ اس مفہوم میں اس سے مراد ہے ارکان خمسہ پر عمومی عمل اور شریعت کی خاص طور پر پابندی

جہاد

راہ خدا میں کوشش، جہد اور سعی و عمل اس کے سب سے عام اور عمومی معنی تو ہیں اپنی شخصی خامیوں کوتاہیوں کے خلاف ذاتی جدوجہد جس کا تقاضا ہر مسلمان سے کیا گیا ہے تا کہ اس کا اسلام کامل ہو سکے اپنے خاص معنی میں جہاد اس جنگ کو کہ

جاتا ہے جو اسلام کے دشمنوں کے خلاف، شرعی طریقے سے کی جائے جیسے دفاع کے لیے جنگ۔ اس کا سب سے متداول مفہوم کسی بھی جنگ کا ہے جسے جنگ آزما لوگ جائز اور شرعی تصور کرتے ہوں۔ جہاد کا یہ تصور شرعی اعتبار سے ایک سوال کا تقاضا کرتا ہے کہ کیا شریعت اس طرح کی لڑائی کو سند جواز دے رہی ہے یا نہیں؟

جن

ایک پراسرار مخلوق جس کے بارے میں کسی قدر ابہام پایا جاتا ہے۔ جسے آگ سے تخلیق کیا گیا ہے۔ اس میں مٹی اور نور دونوں کی صفات پائی جاتی ہیں۔ ان کی نورانیت انہیں کسی حد تک فرشتوں سے مشابہ بناتی ہیں جبکہ ان کی ظلمانیت ان میں مادی جسم والی شے سے مشابہت پیدا کرتی ہے۔ جنات میں سب سے مشہور ابلیس ہے جسے شیطان کے نام سے جانا جاتا ہے۔ انسانوں کی طرح جنات بھی دو گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ابلیس کے پیچھے چلنے والے (حق چھپانے والے) اور نبیوں کے پیروکار (اہل ایمان)

جسم

ہر وہ شے جس کا ادراک حواس خمسہ سے کیا جا سکتا ہے۔ اصطلاحی معنی میں جسم وہ چیز ہے جس کو روح سے علاوہ کر کے اللہ تعالیٰ ایک مخلوق کو وجود عطا کرتے ہیں۔ چنانچہ فرشتوں کا جسم نور کا اور جنات کا جسم آگ کے ہوتے ہیں اور انسانوں اور دوسرے حیوانات کے جسم مٹی کے۔ انسانوں میں جسم کے خواص روح کی صفات کے مقابل مانے جاتے ہیں۔ یعنی روح علوی ہے، جسم سفلی، روح نورانی ہے اور بدن تیرہ، وغیرہ۔ نفس روح اور بدن کے مابین واقع ہے اور دونوں کا رابطہ ہے۔

مکہ کی سمت۔ مسلمان نماز ادا کرتے ہوئے قبلے کا رخ کرتے ہیں۔

قرآن

اسلام کا دینی صحیفہ۔ کلامِ الٰہی جو سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر فرشتۂ وحی جبرئیل علیہ السلام کے ذریعے نازل ہوا۔

کفر

ناشکرے پن سے کتمانِ حق۔ لفظی معنی ڈھانپ کر چھپا کر دینا، ڈھانپ دینا۔ قرآن میں یہ لفظ "شکر" اور "ایمان" دونوں کے متضاد اور الٹ معنی کے لیے آیا ہے۔ قرآن کے تراجم میں اس کا عام ترجمہ unbelief یا infidelity کے الفاظ سے کیا گیا ہے۔ جب اس سے اشارہ انکارِ حق کی طرف تھا اور جب اس سے مقصود ناشکری کا رویہ تھا تو ترجمے کے لیے ingratitude کا لفظ برتا گیا ہے۔ غرض یہ کہ کفر بدترین گناہوں میں سے ایک گنا جاتا ہے کیونکہ اس کا مطلب ہے کہ انسان ناشکرا بن کر اللہ کی ہدایت کو رد کر دے۔

معاد

اللہ کی طرف واپسی۔ ایمان کا تیسرا رکن۔ اس لفظ کو عموماً eschatology کے لفظ سے ادا کیا جاتا ہے۔

مذہب

فقہ کا ایک مکتبِ فکر۔ سنی اسلام میں چار مذاہب فقہ ہیں، حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی۔ شیعہ حضرات کی اکثریت ایک پانچویں مذہب یعنی جعفری مکتبِ فکر کی

پیروکار ہے۔

مدرسہ

درس گاہ۔ تعلیم حاصل کرنے کی جگہ۔

ملک (جمع: ملائکہ)

فرشتہ۔ لفظی معنی فرستادہ، پیغام لانے والا۔ مخلوقات کی ایک قسم جسے انسان اور حیوان کے مقابلے میں الگ مخلوق مانا جاتا ہے اور عموماً جنات سے بھی مختلف کہا جاتا ہے۔ فرشتے نورانی جسم کے ساتھ تخلیق کیے گئے ہیں۔ انسانوں اور جنات کے برعکس وہ کبھی اللہ کی نافرمانی نہیں کرتے۔ جانور بھی فرشتوں کی طرح کبھی اللہ کے نافرمان نہیں ہوتے۔

معراج

لفظی معنی زینہ، سیڑھی۔ رسول خدا ﷺ کا اللہ تعالیٰ کے پاس جانا۔ معراج نبوی۔ یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس نے کائنات کی ماہیت اور مقام انسانی کے بارے میں مسلمانوں کے تصورات کی تشکیل میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔

ملّا

(عربی کے لفظ مولیٰ سے)۔ پیشہ ور علماء میں سے ایک۔

مشرک

شرک کرنے والا۔

مسلم

وہ جو "اسلام" کی صفت سے موصوف ہو۔ "اسلام" کے چار درجات کے لحاظ سے لفظ مسلم کے بھی چار معنی ہیں (دیکھیے "اسلام")

متکلم / متکلمین

وہ علماء جو علم کلام میں خاص مہارت رکھتے ہوں۔

نبی

وہ انسان جو دوسرے انسانوں کے لیے ہدایت خداوندی لے کر آئے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم سے لے کر سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی بھیجے ہیں۔ نبی اور رسول کو عموماً ہم معنی الفاظ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے لیکن اگر ان میں تمیز کیا جائے تو رسول کا درجہ اللہ کے ہاں نبی سے بلند تر ہے۔

نفس

مختلف مسلم مفکرین نے اس لفظ کو کئی طرح سے استعمال کیا ہے۔ عام طور پر اس لفظ سے مجموعی طور پر انسان کی ذات مراد لی جاتی ہے۔ اس کی صفات کو کبھی روح اور بدن کی صفات کے درمیان، درمیانی درجے میں واقع فرض کیا جاتا ہے۔ (دیکھیے روح اور جسم)

شرک

خدا کے ساتھ دوسروں کو شریک کرنا۔ یہ ایک ناقابل معافی گناہ ہے۔ اس کا

مطلب ہے ایسی سوچ یا ایسا عمل جو یہ ظاہر کرے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں کوئی اور بھی شریک ہے۔ توحید اس کا الٹ ہے۔

سنت

زندگی گزارنے اور عمل کا وہ طریقہ جسے رسول خدا نے مقرر کیا۔ یعنی وہ نمونہ مسلمان جس کی پیروی کرتے ہیں تا کہ خدا کی پسندیدہ زندگی کے سانچے میں ڈھل سکیں۔ سنت کا بنیادی ماخذ حدیث ہے۔

اہل سنت

اسلام کی دو بڑی شاخوں میں سے بڑی شاخ جس میں شیعیت کے مقابلے میں تقریباً ۸۵ فیصد مسلمان شامل ہیں۔

سورۃ

قرآن کے ۱۱۴ حصوں میں سے ایک۔ اس کے لفظی معنی ہیں باڑ یا احاطہ۔

علماء (عالم کی جمع)

اہل علم، وہ جو علم رکھتے ہیں۔ یہ وہ عمومی اصطلاح ہے جو ان تمام مسلمانوں کے لیے استعمال کی جاتی ہے جو اپنے دین کا علم حاصل کرنے کے لیے زندگی وقف کر دیتے ہیں۔ عام طور پر ان سے مراد فقہ کا عالم لیا جاتا ہے۔ جو اسلامی قانون میں مہارت رکھتا ہو۔ ان کے معمول کے فرائض میں مساجد میں نماز کی امامت کرنا، نکاح وغیرہ کا انجام دینا اور شریعت کی تشریح و تفصیل۔ اکثر ایک مذہبی پیشہ ور گروہ کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ ویسے وہ تمام لوگ جو اسلامی علوم میں سے کسی ایک شعبے

میں مہارت حاصل کرتے ہیں انہیں ٹھیٹھ معنی میں عالم کہنا چاہیے خواہ وہ تفسیر کا علم ہو، علم حدیث ہو، علم کلام ہو، فلسفہ ہو یا تصوف۔ بعض اسلامی زبانوں میں ان کو ملا کہا جاتا ہے۔

صلوٰۃ

اسلامی عبادت کی ایک شکل۔ روزانہ پانچ نمازیں دین کے ارکان خمسہ میں سے ہیں۔

شہادت

گواہی دینا ایمان کی شہادت جو عربی کے دو فقرے "لا الٰہ الا اللہ" اور "محمد رسول اللہ" ادا کر کے دی جاتی ہے۔ کلمات شہادت ادا کرنا اسلام کا پہلا رکن ہے جبکہ یہ لفظ شہادت "توحید" کی بنیادی تعریف اور ایمان کی اساس ہے۔ ایمان اسلام کی دوسری جہت ہے۔ شہادت کا ایک مطلب "مرئی دنیا" بھی ہے۔ اس کے مقابل غیب کی دنیا ہے۔

شریعت

لفظی معنی گھاٹ یا پانی کو جانے کا راستہ، اللہ کا نازل کردہ قانون جس سے دین کے اوامر و نواہی کا تعین ہوتا ہے۔ اس سے اسلام کی پہلی جہت کی وضاحت ہوتی ہے۔ اس کی بنیاد قرآن اور رسول خدا ﷺ کی سنت پر ہے۔ شریعت کے دوسرے ماخذ میں اجماع اور قیاس شامل ہیں۔

شیعیت

اسلام کی دو شاخوں میں سے ایک جس میں تقریباً ۱۵ فیصد مسلمان شامل ہیں۔ عام طور پر یوں کہا جاتا ہے کہ شیعہ سنی میں فرق ایک تو فقہ کے مکتبِ فکر کا ہے اور دوسرے بعض اجزائے ایمان کا بالخصوص امامت یعنی یہ عقیدہ کہ رسول اللہ ﷺ کی اولاد میں سے چند لوگ جنہیں امام کہتے ہیں نوعِ انسان اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ایک واسطہ ہیں۔

نبوت

ایمان کا دوسرا رکن۔ نبی کے لفظ سے مشتق۔

ارکانِ خمسہ

قرآن و حدیث کے فرض کردہ پانچ بنیادی کام جو مسلمانوں کے لیے لازم کیے گئے ہیں: شہادت، نماز، رمضان کے روزے، زکوٰۃ اور حج۔

اصل (اصول) ثلاثہ

وہ بنیادی تصور جو قرآن مجید کی اساس و بنیاد ہیں اور جن پر اسلامی عقائد کی بنیاد رکھی گئی ہے: توحید، نبوت اور معاد۔

قدر

لفظی معنی ناپ تول کرنا، پیمائش سے حصہ دینا۔ اجزائے ایمان میں سے ایک۔

رمضان

اسلامی تقویم کا نواں مہینہ۔ اس مہینے میں ہر روز صبح سے غروب آفتاب تک روزہ رکھنا دین کے پانچ ارکان میں سے ایک ہے۔

رسول

پیامبر، ایک خاص نوع کا نبی (دیکھیے نبی)۔ رسولوں کی تعداد ۳۱۳ بتائی جاتی ہے۔ یہ دعوت کی بنیاد رکھتے ہیں جبکہ وہ نبی جو رسول نہیں ہوتے وہ پہلے سے قائم شدہ دعوت میں ترمیم یا اصلاح کرتے ہیں۔

روح

وہ نفخ ربانی جو اللہ تعالیٰ نے آدم کی مٹی میں پھونکی۔ فرشتوں کو بھی روح کہا گیا ہے یہ وہ روح جسے جسم نورانی میں پھونکا گیا۔ تمام مرئی اشیاء میں نادیدہ روح ہوتی ہیں۔ جب روح و نفس میں تمیز قائم کی جائے تو مراد یہ ہوگی کہ روح ایک بلند تر سطح کی چیز ہے اور تمام صفات خداوندی میں براہ راست شراکت کرتی ہیں۔

خلافت

خلیفہ کی صفت

واجب

وہ جو شریعت کی رو سے ضروری و لازم ہو جیسے پانچ وقت نماز۔ اعمال جن پانچ اقسام میں بانٹا گیا ہے ان میں سے ایک واجب بھی ہے۔

زکوۃ

شرعی ٹیکس۔ پانچ ارکانِ دین میں سے ایک۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ جل جلالہ

English	معنی	اسم	نمبر
The Infinitely Good	بے حد و رحمت والا، نہایت مہربان	الرحمن	۱
The All Merciful	رحم والا، رحمت رکھنے والا	الرحیم	۲
The King	راج کرنے والا، بادشاہ، مالک	الملک	۳
The All-Holy	پاک، ہر عیب سے پاک	القدوس	۴
Peace	سلامتی بخشنے والا، تمام نقائص سے پاک	السلام	۵
The Sure, the Faithful, the Safety-Giver	امان دینے والا، پناہ میں رکھنے والا، امن دینے والا	المؤمن	۶
The Guardian, the Protector	محافظ، نگران	المہیمن	۷
The Almighty, the Inestimably Precious the Hard of access	غالب، بڑائی کا مالک، بلند مرتبہ	العزیز	۸
The Irresistible, the All-Overpowering	زبردست، سب پر حاکم، جس کا حکم اٹل ہو	الجبار	۹

۱۰	المتکبر	کبریائی کا مالک، اپنی عظمت کا ظہور کرنے والا	The Proud, the Grand.
۱۱	الخالق	پیدا کرنے والا، عدم سے وجود میں لانے والا	The Creator
۱۲	البارئ	بنانے والا، جس کی تخلیق میں کوئی نقص نہ ہو	The Maker
۱۳	المصور	صورت بخشنے والا	The Former
۱۴	الغفار	بے حد بخشش فرمانے والا، عیب پوشی کرنے والا	The Ever-Forgiving
۱۵	القہار	سب کو مغلوب رکھنے والا، غالب	The Ever-Compeling
۱۶	الوہاب	بن مانگے عطا فرمانے والا	The Ever-Giving
۱۷	الرزاق	رزق دینے والا	The Ever Providing
۱۸	الفتاح	کھولنے والا، مشکل کشا، فتح بخشنے والا	The opener (or the inward eye, of the way to success) the Victory- Giver
۱۹	العلیم	علم والا، ہر چیز کو پورا جاننے والا، جس کا علم کسی [illegible] ذریعے کا پابند نہ ہو	The Omniscient

He Who contracts, the Straitener	رزق وغیرہ بند کر دینے والا، روک لگانے والا، روزی تنگ کر دینے والا	القابض	۲۰
He Who expands, the Munificent	رزق وغیرہ کھول دینے والا	الباسط	۲۱
The Abaser	پست کرنے والا، ذلیل کر دینے والا	الخافض	۲۲
The Exalter	بلند کرنے والا، عروج دینے والا	الرافع	۲۳
The Honourer, the Enhancer	عزت دینے والا	المعز	۲۴
He Who humbles	ذلت دینے والا	المذل	۲۵
The All-Hearing	سننے والا	السمیع	۲۶
The All- Seeing	دیکھنے والا	البصیر	۲۷
The Arbitrator, the Decider	فیصلہ کرنے والا	الحکم	۲۸
The Just, Justice,	انصاف ہمہ سر انصاف	العدل	۲۹

The Benign, the Subtle, the All-Penetrating, the Gently All-Prevailing.	باریک بین، چھوٹی چھوٹی چیزوں کا علم رکھنے والا، ذہن کا مشاہدہ نہ کیا جا سکے، باورا ادراک قائم خارجی و داخلی حدود سے ماورا	۳۰ اللطیف
The Aware, the All-Knowing	ہر شے کی خبر رکھنے والا، چیزوں کے باطن سے واقف	۳۱ الخبیر
The Mild, the Indulgent.	درگزر کرنے والا، تحمل اور برداشت والا، بردبار	۳۲ الحلیم
The Infinite, the Immense.	عظمت و کبریائی کا مالک	۳۳ العظیم
The All-Forgiving.	بار بار معاف کرنے والا	۳۴ الغفور
The Grateful	تھوڑے سے عمل پر بہت اجر دینے والا، قدردان	۳۵ الشکور
The High.	بلند	۳۶ العلی
The Great	بڑائی کا مالک، بزرگی والا	۳۷ الکبیر
The All-Preserver	حفاظت کرنے والا	۳۸ الحفیظ
The All-Nourisher the Overseer of all, Providence	روزی پیدا کرنے والا، قدرت رکھنے والا	۳۹ المقیت

۴۰	الحسیب	حساب لینے والا، کفایت کرنے والا کافی	The All-Sufficient, the All Calculating.
۴۱	الجلیل	عظمت وجلال والا	The Majestic
۴۲	الکریم	بے انتہا عطا فرمانے والا سخی	The Generous, the All-Bountiful, the Magnanimous
۴۳	الرقیب	نگہبان محافظ	The All-Observing, the Vigilant.
۴۴	المجیب	جواب دینے والا دعا میں قبول فرمانے والا حاجت روا	The All-Answering, the Responsive, the Granter of Prayers
۴۵	الواسع	جس کے علم نے ہر چیز کو گھیر رکھا ہو جس کی رحمت وسیع ہو	The Vast, the All-Capacious
۴۶	الحکیم	حکمت والا دانائی کا مالک	The Wise
۴۷	الودود	محبت فرمانے والا	The Loving - Kind
۴۸	المجید	عزت وشرف والا	The All-Glorious,

۴۹ الباعث	اٹھانے والا، انبیاء کو بھیجنے والا، قبروں سے نکالنے والا، عدم سے وجود میں لانے، قیامت کے دن مردوں کو زندہ کرنے والا	The Raiser of the Dead, the Sender
۵۰ الشہید	حاضر و ناظر، دیکھنے والا، کہ جس سے کوئی چیز پوشیدہ نہ ہو، جس کے سامنے غیب نہ ہو	The All-Witnessing, the Directly Perceiving
۵۱ الحق	حق، حقیقی	Truth, the True
۵۲ الوکیل	کارساز، جس پر بھروسہ کیا جائے	The All-Reliable
۵۳ القوی	قوت والا، جس کی قوت سب پر غالب ہو	The Overpoweringly Strong
۵۴ المتین	جسے ہلایا نہ جا سکے، مضبوط، اٹل، اپنے مقام پر قائم رہنے والا	The Steadfastly Strong, the Firm.
۵۵ الولی	مددگار، دوست، کارساز	The Patron, the Helper
۵۶ الحمید	لائق تعریف، سراہا ہوا	The All-Praiseworthy
۵۷ المحصی	گھیر لینے والا، جس کا علم اور قدرت ہر چیز پر حاوی ہو	The Counter, the Knower of each separate thing.

۵۸	المبدئ	عدم سے وجود میں لانے والا، آغاز کا خالق	The Beginner, the Cause
۵۹	المعید	دوبارہ تخلیق کرنے والے فنا کے بعد شے کو دوبارہ زندہ کرنے والا جس کی طرف ہر ایک کو پلٹنا ہے	The Bringer-back, the Restorer, the Transformer
۶۰	المحیی	زندگی دینے والا، زندگی کا خالق	The Life-Giver
۶۱	الممیت	موت دینے والا، موت کا خالق	The Slayer
۶۲	الحی	زندہ	The Living
۶۳	القیوم	جو اپنی ذات سے قائم ہو اور کسی شے کے بغیر قائم رہ سکتی ہو	The Self-Existing, the All-Sustaining
۶۴	الواجد	جس کے سامنے ہر شے حاضر ہو	The Complete, the Finder, The All-Resourceful, the Unfailing, the Unneeding.
۶۵	الماجد	عزت و شرف والا	The Magnificent.
۶۶	الواحد	یکتا، یگانہ، اکیلا، ایک	The One, the Sole, the Indivisible.

٨٤	ذوالجلال والاکرام	بڑی شان اور ہر کمال کا مالک	The Lord of Majesty and Bounty
٨٥	المقسط	انصاف سے فیصلہ کرنے والا عادل	The Equatable the Reguler
٨٦	الجامع	قیامت کے روز سب کو جمع کرنے والا	The Assembler;the Uniter
٨٧	الغنی	بے نیاز	The Infinitely Rich,the Absolutely Independent
٨٨	المغنی	بے نیاز کر دینے والا، مال دار کر دینے والا	The Enricher;the Availer
٨٩	المانع	روکنے والا	The Preventer the Shielder;the Defender
٩٠	الضار	جسے چاہے نقصان اور تکلیف میں مبتلا کر دینے والا	He Who harms
٩١	النافع	نفع پہنچانے والا، برکت دینے والا	He Who benefits
٩٢	النور	نور	The Light
٩٣	الہادی	ہدایت بخشنے والا، مقصود و مطلوب تک پہنچانے والا، اپنے قرب کا راستہ دکھانے والا	The Guide,

The Peerless, the Marvellous, the Originator	شیء کو کسی مثال کے بغیر بنانے والا	۹۴ البدیع
The Permanent, the Eternal	ہمیشہ رہنے والا	۹۵ الباقی
The Heir, the Inheritor	موجودات کی فنا کے بعد بھی باقی رہنے والا	۹۶ الوارث
The Infallibly Right (in guidance and in knowledge)	رشد و راستہ دکھانے والا جس کی ہدایت اور علم میں کوئی ٹیڑھ نہیں ہے	۹۷ الرشید
The All-Patient, the Long-Suffering, the Forbearing	صبر و تحمل والا	۹۸ الصبور

حواشی و تعلیقات

تمہید

۱۔ اپنے طالب علموں کو جو کتب ہم پڑھنے کے لیے تجویز کرتے ہیں وہ درج ذیل ہیں

عبدالمجید ڈورر "اسلامی روایت ایک تعارف"، ہارپر اینڈ رو، نیویارک، ایچ ٹی ہاؤس، ۱۹۸۸، طبع مکرر ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۹۰ء؛ ایف ایم ڈینی، اسلام ایک تعارف، میکملن، نیویارک ۱۹۸۵ء؛ حسن عبدالحکیم گائی ہٹن، اسلام اور تقدیر انسانیت، ہیوسٹن، نیویارک، سونی پریس، ۱۹۸۵ء، طبع مکرر، سہیل اکیڈمی، لاہور ۱۹۸۸ء، ۱۹۹۹ء؛ جے اسپوزیٹو، اسلام، صراط مستقیم، نیویارک آکسفورڈ، ۱۹۸۸ء؛ گب ایچ اے آر گب، محمدیت، لندن آکسفورڈ، ۱۹۴۹ء؛ سید حسین نصر، اسلام حقائق اور تصورات، لندن، ۱۹۴۹ء، طبع مکرر، سہیل اکیڈمی، لاہور ۱۹۹۹ء؛ جے رینارڈ، محمد کے نقش قدم پر، نیویارک، ۱۹۹۲ء؛ این میری شمل، اسلام ایک تعارف، البانی، سونی پریس، ۱۹۹۲ء۔

تعارف

۱۔ "اسلام" کا لفظ اور عربی زبان میں اس کی متعدد معنویت اس کتاب کے اکثر مباحث کے لیے کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ اردو میں کثرت استعمال اور عادات نظر نے اس لفظ کو اسی کے معنی کا حجاب بنا دیا ہے۔ اس لیے ترجمہ کرتے ہوئے ہم نے لفظ کو ہر جگہ سیاق و سباق اور مباحث کی رعایت سے کھولنے کی سعی کی ہے۔ مصنفین

کی نگاہ میں اس کے بنیادی معنی ہیں Submission to God's Will۔ اس مفہوم کو اردو اہل قلم نے کئی طرح ادا کیا ہے۔ دینی موضوعات پر لکھی جانے والی اردو کتب کا جائزہ لیجیے تو "اسلام" کے معنی کے ابلاغ کے لیے مندرجہ ذیل تراکیب اور پیرایۂ اظہار سامنے آتے ہیں:

سر تسلیم خم، بندگی، اطاعت، فرمان برداری، منشائے خداوندی کو مان لینا، منشائے ایزدی کو تسلیم کرنا، منشائے الٰہی کو قبول کر لینا، مرضیٔ مولا، رضا بہ رضا، سر افگندگی، حکم خداوندی کے سامنے جھک جانا۔ بعض مصنفین نے ذرا آگے بڑھ کر اس کے اطلاقی معنی کی طرف بھی اشارہ کیا ہے یعنی ہر مخلوق، کائنات کی ہر شے کا اپنے وجود اور اپنی بقا کے لیے خالق پر انحصار، احتیاج وجود و بقا، ہر چیز کا رو بہ رزائیت اور کارخانہ قدرت کا اللہ کے حکم و حکمت پر چلنا۔

ترجمہ کرتے ہوئے ہم نے معانی کے کئی رنگ پیش نظر رکھے ہیں اور موقع محل کے لحاظ سے اسی ایک لفظ "اسلام" کو "موزوں شکل" سے باندھنے کی کوشش کی ہے۔ (مترجم)

۲۔ یہ کتاب چونکہ مغربی قارئین کے لیے لکھی گئی اور مغربی طلبہ سے اس کے مکالمے کے عمل اور رد عمل کے ایک طویل سلسلے کی پیداوار ہے لہٰذا اس میں جہاں جہاں آپ کو یہ تبصرے اور آرا ملیں گی جو مغربی ماحول ہی کو مخاطب ہیں ہمارے ہاں کے سیاق میں اجنبی لگیں گی۔ ہم نے انھیں متن میں باقی رکھا ہے۔ مقصود تسلسل کلام بھی ہے اور یہ اندیشہ بھی کہ ہمارے معاشرے کا ایک حلقہ بھی تقریباً ویسا ہی ہو چکا ہے جس کی "اکثریت نے غالباً اس کتاب مجید کو دیکھا تک نہ ہوگا"۔ (مترجم)

۳۔ قرآن مجید، ۴: ۱۳۔

۴۔ سماجی ڈارونیت سے مراد ڈارون کے حیاتیاتی مفروضۂ ارتقا کی سماجی تعبیر اور سیاسی، معاشرتی اطلاق کی طرف اشارہ ہے۔ ڈارون کے مفروضے کو جب انسانی معاشروں کے مطالعے کے لیے برتا گیا تو اس سے یہ نادر نتیجہ برآمد ہوا۔ جیسے حیاتیات میں انسان وہ ذی شعور ہستی ہے جو بے شعور مادے کے مزعومہ ارتقا کے نتیجے میں صدیوں کے مبہم عمل ارتقا کے بعد حیوانات کی سطح سے بلند ہو کر سوچنے والے دوپائے کی حیثیت اختیار کرتا ہے اسی طرح انسانی معاشروں کے تقابل میں مغرب کا سفید انسان صدیوں کے عمل ارتقا میں انسانوں کی درجہ بندی کے حوالے سے درجہ اوّل یا صف اوّل کی مخلوق ہے، ارتقا یافتہ ہے، ترقی یافتہ ہے، برتر ہے اور باقی سب معاشرے، بشمول مذاہب تذلیل، پس ماندگی، درجہ دوم، سوم کی ترقی پذیر، کم عقل اور پست ذہن انسانی نسلوں پر مشتمل ہیں۔ درجہ اوّل کی مخلوق کو ارتقا سے ترقی کا یہ حق حاصل ہے کہ وہ دوسرے درجے کی مخلوق کو سدھانے اور سدھارنے کے لیے غلام بنائے، ان کو "تہذیب" سکھانے کے لیے ہر ممکنہ "کوشش" کرے اور خود ان کی بہتری کے لیے ان کی (پس ماندہ، مشرقی نیز توہم پرستانہ) اقدار کو تبدیل کرے اور ان کے سماجی بندوبست علاوہ اس کے تعلیمی نظام اور ان کے ذہنی ڈھانچے کو مغربی بنیادوں کے مطابق تبدیل کر کے اسے مغرب کے انسان کے قریب تر لائے۔

(مترجم)

۵۔ جو اعتراضات اور تنقید ہمارے پیش نظر ہیں ان کے بارے میں مزید جاننے کے لیے ان کتابوں کی فہرست دیکھیے جو لارنس ای سلیوان نے اپنی اہم کتاب میں دی ہے۔ دیکھیے ایکانچو کا نقارہ۔ جنوبی امریکہ کے مذاہب میں معانی کی تلاش،

نیویارک، ۱۹۸۸ء، صفحات ۸۹۔۹۳۔ مطالعہ کتب کے یہ مصنف نے جو فہرست
تجویز کی ہے اس سے پہلے ہال مغرب کے بارے میں کچھ آراء دی ہیں اس کا
خلاصہ اس طرح فہم پر بھی ہوتا ہے جو مغرب والوں نے اسلام کو سمجھنے میں اختیار کیا
ہے۔ ’’جنوبی امریکہ کے مذاہب (یہاں اسلام پڑھیے) کو سمجھنے میں سب سے بڑی
خرابی وہ ہے جو قبائلی اقوام کے بارے میں ہمارے تصورات نے پیدا کی ہے یعنی
ایک تغیر ناپذیر نظام کی شناخت، تقلید جسے دیومالائی تشبیہات میں ظاہر کیا گیا ہو، اس
کے بارے میں کسی نے کبھی سوال نہ اٹھایا ہو اور جسے بغیر ترمیم کے نسلاً بعد نسل منتقل
کیا جاتا رہا ہو۔ اس رویے کے ساتھ ایک اور چیز بھی چلتی ہے: کسی دین کے مرکزی
خیال یا myth کو جوڑ یک پہلو، سمجھنے اور بے کار قصے سے آگے۔ قبائلی اقوام
سوچ کے ’’پرچین قدیمی‘‘ انداز کے نمائندے ہیں۔ وہ سچے دیومالائی قصوں سے
بچگانہ انداز میں چپکے ہوئے ہیں۔ بچی طفلانہ خواہشات کے اسیر ہیں جبکہ ان کے
جدید معاصرین نے ’’زمانِ تاریخی‘‘ کے ساتھ ساتھ دیومالائی خیالات کا جوا اپنی
گردن سے اتار پھینکا ہے اور ’’جدیدیت‘‘ کے دور میں ’’داخل‘‘ ہو رہے ہیں۔ یہ اور
اس طرح کے اور بہت سے جواہر پارے آپ کو ان تحریروں میں نظر آئیں گے جو
حقیقت اساطیر (Myth) (یہاں بھی اس جگہ فکر اسلامی پڑھیے) اور رسوم و شعائر کی
داخلی معنویت کی اور حقیقت سے آنکھیں چار کرنے سے گریز کرتی ہیں۔ یہاں
موقع نہیں ہے کہ ہم مذہب اور Myth اساطیر کے بارے میں چھپے ہوئے ’’جدید‘‘
تصورات کی تاریخ بیان کریں، بس اتنا کہنا کافی ہوگا کہ عہد انکشاف Age of
Discovery میں جب مغرب کی تہذیب اور اس کے مزاج تحقیق نے پہلے پہلے
تمدن کے علاوہ دوسری تہذیبوں کی تمدنی دنیا کے تنوع کا سامنا کیا تو اسے چھپانے اور
چھپانے کی حقیقت سے آنکھیں چرانے اور اپنے مذہب چھپنے کے اس عمل نے جو شبہ ہر

طرح کے خیال اور من گھڑت "حقائق" بتاتے چلے جانے کا سلسلہ شروع کر دیا۔

Enlightenment یا روشن فکری کا دور کیا تھا؟ تہذیبی اقدار کی دائرہ در دائرہ کھینچتی دنیا سے مغرب کے مفکرین کی بے پناہ اور سراسیمہ خیالی سے حقیقت دنیا میں فرار۔ اسی کے جلو میں فکریات کے نئے علاقے تحت ڈھالنے کا فکری عمل شروع ہوا۔ اصطلاحات نئی اس جدید نقادی سے مغربی کلچر کے ایک نئے معنی پیدا کر دیئے۔ مغربی کلچر نے اپنے تئیں اپنی ایک نئی تعریف متعین کی۔ یہ اصطلاحات تھیں شعور/لاشعور، وحشی، جاہل ملائم/مہذب، تہذیب یافتہ، اخلاق، اقدار، قانون، رواج، تقلید یا استدلالی فکر/عمل۔

۶۔ انگریزی میں اس کو آگری ہی سے بعینہ اسی طرح بیان کیا ہے جیسا کہ کلاسیکی کتاب سیرت میں ملتا ہے تو وہ ہے ابوبکر سراج الدین (مارٹن لنگز) کی کتاب محمد۔ ولین کتاب سیرت پر مبنی حیات نبی (انگریزی) سہیل اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۸ء۔

۷۔ ایف ای پیٹرز، یہودیت، مسیحیت اور اسلام۔ کلاسیکی ماخذ اور تشریحات، پرنسٹن، پرنسٹن یونیورسٹی پریس، ۱۹۹۰ء، ص ۵۔

۸۔ متن کتاب میں قرآنی آیات کثرت سے نقل ہوئی ہیں۔ ہم نے اہتمام کیا ہے کہ آیات کا اصل عربی متن ہر جگہ درج کیا جائے۔ متن کے بعد آیت کا حوالہ ہے اور پھر اردو ترجمہ۔ اردو ترجمے کے لیے کسی ایک متعین ترجمے کو استعمال نہیں کیا گیا۔ سبھی معروف تراجم پیش نظر رکھے گئے ہیں۔ فتح محمد جالندھری، بیان القرآن، تفہیم القرآن، تدبر قرآن اور جاوید احمد غامدی صاحب کے تراجم سے بالخصوص استفادہ کیا گیا ہے (مترجم)۔

۹۔ حدیث کی اس نوع کی معنویت کے بارے میں دیکھیے ڈابیو۔ گراہم کلامِ خداوندی ورقولِ رسول۔ ابتدائی اسلام میں، دی ہیگ، ماؤٹن، ۱۹۷۷ء۔

۱۰۔ شیعہ کے لفظی معنی ہیں "حامی"، "ساتھی" یا "گروہ کا آدمی"۔ جن لوگوں نے اس معاملے میں سیدنا علیؓ کا ساتھ دیا وہ شیعانِ علی کہلائے اور اسی سے "شیعہ" اور "شیعی" کے الفاظ مروج ہوئے۔ (مترجم)

۱۱۔ مثال کے طور پر دیکھیے محمد ان نقیب مصری (م۔ ۷۶۹ھ/۱۳۶۷ء)، دی ریلائنس آف دی ٹریولر، مسافر کا سہارا، ترجمہ نوح ہا میم کیلر، ایوینشن، امانہ پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء، ص ۱۵ تا ۸۰۷۔ اسی طرح ایک افریقی مسلمان نے جس طریقے کو جس طرح ان پڑھ قبائلی لوگوں میں اسلام کی بنیادی باتوں کا فہم پیدا کرنے کے لیے برتا ہے وہ بھی دلچسپ ہے۔ دیکھیے لیل بریز، مغربی افریقہ کا ایک صوفی۔ عمر سالف طال کی میراث دینی اور روحانی تلاش، برکلے، لاس اینجلس، کیلی فورنیا یونیورسٹی پریس، ۱۹۹۴ء، ص ۹۲ ۔ ۱۸۔

۱۲۔ احادیث کے ماخذ ضمیمے میں دیے گئے ہیں۔ متعلقہ حواشی میں بھی حوالے درج کر دیے گئے ہیں۔ حدیث جبرئیل کے ماخذ کے لیے دیکھیے، صحیح مسلم، ایمان ۱، بحوالہ الکتب الستہ (موسوعۃ الحدیث الشریف) طبع سوم، دار السلام، ریاض، ۲۰۰۰ء، ص ۶۸۱۔ کتاب میں متنِ حدیث کے لیے سب جگہ اسی ماخذ کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ (مترجم)

۱۳۔ متنِ حدیث میں "دین" کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ عربی کے اس کلیدی لفظ کو انگریزی میں عموماً religion کے لفظ سے ترجمہ کیا جاتا ہے جو کئی لحاظ سے ایک نامکمل اور تشنہ ترجمہ ہے۔ عربی کے لفظ "دین" کی تہ داری اور متعین معانی

تک اس کی رسائی نہیں ہو پائی۔ خود انگریزی میں religion کا لفظ اپنے ابہام
کے سبب بدنام ہے ورنہ لوگوں کے ہاتھوں میں آ کر تو یہ اور بھی مبہم اور طے شدہ معانی
سے عاری ہو جاتا ہے جن کا کاروبار بقدر رسمی مطالعۂ دین سے متعلق ہے۔ مصنف
نے یہاں ان مسائل کو چھیڑنے سے احتراز کیا ہے جو ان لفظوں کے انگریزی
ترجمے میں گھیرے رہتے ہیں اور صرف اسلام کے سیاق و سباق میں اس کی معنویت
کی طرف اشارے کیے ہیں۔ (مترجم)

۱۴۔ مصنف نے "دین" کے معانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انگریزی
مترادفات کی فہرست دی ہے۔ ہم نے انہیں اردو میں دیکھا ہے۔ (مترجم)

۱۵۔ یعنی اگر "دین" کے پہلو دار، کئی سطحوں پر مبنی لفظ کو صرف religion کے
کھرے اور مبہم لفظ کے سہارے سے سمجھنے کی سعی کی جائے۔ (مترجم)

۱۶ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ جب صیغۂ واحد متکلم میں خطاب فرماتے ہیں تو اس
کے لیے کہیں "انا" (میں) اور کہیں "نحن" (ہم) کا لفظ آتا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ
'ہم' کا استعمال فرسطائی کا آئینہ دار ہی شاہانہ اسلوبِ کلام ہے جس میں شہنشاہ اپنے
کشتہ رعایا سے شاہ و سلطان خطاب کرتے آئے ہیں۔ بادشاہ اپنے لیے "ہم" کا
صیغہ استعمال کرتا ہے تو اس لیے کہ وہ اپنی قلمرو کے مرکزی آواز ہوتا ہے۔
مسلمانوں میں بعض علمائے الٰہیات نے جتنا یہ بھی لکھا ہے کہ جب آیاتِ خداوندی
"انا" کے لفظ سے شروع ہو تو مراد ذاتِ خداوندی سے ہے جو واحد و یکتا ہے۔ اس
کے برعکس جب آیت میں "نحن" (ہم) کا لفظ آئے تو اشارہ متعدد اسما و صفات کی
جانب ہوتا ہے۔ اس تعدد سے عالمِ خلق میں کثرت کا ظہور ہوتا ہے۔

۱۷۔ یہاں ہم نے صحیح مسلم کا متن استعمال کیا ہے۔ اس کی جگہ اگر صحیح بخاری سے متن حدیث اخذ کیا جاتا تو "ایمان" کا ذکر "اسلام" سے پہلے آتا اور تفصیلات میں قدرے فرق نظر آتا۔

۱۸۔ دیکھیے سنن ابن ماجہ، حدیث ۲۲۴، بحوالہ مکتب الستہ مجموعہ ناقل، ص ۲۴۹۔

۱۹ اور اس کا موازنہ آج کے علمی اداروں سے کر کے دیکھیے۔ اگر سند اور ڈگری کی کشش نہ ہو تو کل ان اداروں سے اکثر پڑھنے والے رفو چکر ہو جائیں گے

۲۰۔ جوناتھن برکی، عہد وسطیٰ کے قاہرہ میں ابلاغ علم۔ اسلامی تعلیم کی سماجی تاریخ، پرنسٹن، پرنسٹن یونیورسٹی پریس، ۱۹۹۲ء، ص ۲۱۷۔

۲۱۔ قرآن مجید کی اسلامی تعبیر کے تنوع اور تفصیل کا ایک جائزہ محمود ایوب کی زیر ترتیب سلسلہ تصنیف میں ملتا ہے۔ اس سلسلے کی دو جلدیں چھپ چکی ہیں۔ دیکھیے محمود ایوب، قرآن اور مفسرین قرآن، دو جلد، البانی، نیویارک اسٹیٹ یونیورسٹی پریس، جلد اول ۱۹۸۴ء، جلد دوم ۱۹۹۲ء۔

۲۲۔ جان اسپوزیٹو اسلام کے بارے میں اچھی رائے رکھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ "اسلام کسی نئے دین کا نام نہیں ہے جو ایک صحیفہ لے کر آیا ہو۔ مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے دیکھیے تو اسلام کو دنیا کے ممتاز توحیدی مذاہب میں سے سب سے آخری نہیں بلکہ سب سے قدیم دین کہنا ہوگا"۔ دیکھیے اسلام۔ صراط مستقیم، آکسفورڈ، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۸۸ء، ص ۲۲۔ بہت سے مسلمان واقعی اسی بات کے قائل ہیں لیکن اس نکتے کو تسلیم کرنے کے لیے قرآن میں مذکور "اسلام" کے مختلف مصطلحاتی مفاہیم کو گڈمڈ کر دیتے ہیں۔

۲۳۔ اسلام کی تقویم میں بھی اہل یہود کی طرح شب و روز کا آغاز غروب آفتاب سے شروع ہوتا ہے۔

۲۴۔ قرآن میں صبح صادق کا وقت معلوم کرنے کا جو طریقہ بیان ہوا ہے اس کے مطابق اندھیری رات میں جب سفید ڈورا سیاہ ڈورے سے الگ نظر آنے لگے تو وقت سحر شروع ہوتا ہے۔ یہ وقت طلوع آفتاب سے لگ بھگ گھنٹہ سے ڈیڑھ گھنٹہ قبل کا ہو گا اور اس میں ہر علاقے کے عرض بلد کے لحاظ سے فرق واقع ہو جائے گا۔ اسلامی ممالک میں اکثر لوگ کسی نہ کسی مسجد کے قرب و جوار میں رہتے ہیں اور ہنگام سحر ان کو اذان کی آواز ضرور سنائی دیتی ہے۔

۲۵۔ رک بخاری، "مواقیت الصلاۃ" ، مسلم، "مساجد" بحوالہ الکتب الستہ مجموعہ قبل، ص ۳۴۴۔

۲۶۔ رک امام غزالی، احیاء العلوم الدین، ۶ جلد، بیروت دار الہادی ۱۹۹۲ء، ۳۰۱۳

۱۲۔ اسمائے خداوندی کی ایک فہرست اور اس کا ترجمہ دیکھنے کے لیے رجوع کیجیے، ضمیمہ اوّل "اسمائے الٰہیہ"

۱۳۔ ر۔ک، ابن ماجہ، "زہد"، ۳۵، بحوالہ الکتب الستہ محولۂ ما قبل، ص ۲۷۳۸۔

۱۴۔ ر۔ک، ابوداؤد، "صلوٰۃ"، ۴۸، بحوالہ الکتب الستہ محولۂ ما قبل، ص ۱۲۸۸۔

۱۵۔ حوالہ بالا، "کتاب … باب" ۹۱، بحوالہ الکتب الستہ محولۂ ما قبل، ص ۱۵۰۵۔

۱۶۔ ر۔ک، صحیح بخاری، "توحید"، ۵۵، بحوالہ الکتب الستہ محولۂ ما قبل، ص ۶۳۰۔

۱۷۔ ر۔ک، صحیح بخاری، "تیمم"، ۵، بحوالہ الکتب الستہ محولۂ ما قبل، ص ۲۷۰۔

۱۸۔ سفرِ معراج کے بیان کی علامتی معنویت کی اگر ایک جھلک دیکھنا ہو تو مصوری کے ان نمونوں میں دیکھنا چاہیے جہاں سفر کے مناظر miniatures (تصاویرِ مصغر) میں نقش کیے گئے ہیں۔ ان پر نظر کرتے ہی یہ بات واضح ہو جاتی ہے جن دنیاؤں کی صورت گری ان منی ایچر تصویروں میں کی گئی ہے وہ ہستی کی کسی اور اقلیم میں واقع ہیں۔ مثال کے طور پر دیکھیے ایم۔ آر۔ سیگول، محمد کا معجزاتی سفر (انگریزی) نیویارک، جارج بریزیلر، ۱۹۷۷ء۔ اس کتاب میں پندرہویں صدی کے ایک ترک مخطوطے سے لے کر خوبصورت رنگین عکسی نقول شامل کی گئی ہیں۔

۱۹۔ ان فرشتوں کے بارے میں تفصیلات کے لیے دیکھیے، ساچیکو موراتا، "فرشتے" در سید حسین نصر (مرتب) اسلامک سپریچوئلٹی: فاؤنڈیشنز (انگریزی)، سہیل اکیڈمی، لاہور، ۲۰۰۰ء، صفحات ۳۲۴ـ۳۴۴

۲۰۔ جہاں میں دانش و بینش کی ہے کس درجہ ارزانی

کوئی شے چھپ نہیں سکتی کہ یہ عالم ہے نورانی (اقبال)

یوں تو اس کتاب کو پڑھتے ہوئے قدم قدم پر اقبال کے اشعار کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے لیکن یہ شعر تو لفظاً بھی اس پیرا گراف کی نمائندگی کرتا ہے۔ فکر اقبال کی اساسی مسائل کو واضح کرنے کے لیے یہ کتاب ایک اہم دستاویز ہے (مترجم)

۲۱۔ دیکھیے، جامع ترمذی، "زہد"، ۱۳، موسوعۃ الکتب الستہ مجموعہ، اقبال جس، ۱۸۸۵، نیز سنن ابن ماجہ، "زہد"، ۳۰، موسوعۃ الکتب الستہ مجموعہ، اقبال جس، ۲۷۲۷

۲۲۔ اسلامی روایت میں پانی اور آمیزۂ آب و گل کو کس طرح سمجھا گیا ہے، یہ دیکھنے کے لیے رجوع کیجیے سچیکو مراتا، تاؤ آف اسلام (انگریزی) سہیل اکیڈمی، لاہور، ۲۰۰۰ء، باب چہارم و پنجم

۲۳۔ یہ روایت پہلے ماخذ میں جس طرح نقل ہوئی ہے اس پر ایک نظر کے لیے دیکھیے فرز روزنتھال تاریخ طبری (انگریزی ترجمہ) البانی، نیو یارک ہوش پریس، ۱۹۸۴ء، صفحات ۲۵۸۹۔

۲۴۔ "روح القدس" کے حوالے کے لیے دیکھیے قرآن مجید، ۲: ۸۷، ۲۵۳؛ ۵: ۱۱۰؛ ۱۶: ۱۰۲۔

۲۵۔ "روح" کے حوالے کے لیے دیکھیے قرآن مجید، ۴: ۱۷۱؛ ۱۲: ۸۵؛ ۱۷: ۸۵؛ ۱۹: ۱۷؛ ۲۶: ۱۹۳؛ ۱۵: ۲۹؛ ۳۸: ۷۲؛ ۷۸: ۳۸؛ ۹۷: ۴۔

۲۶۔ اسی کی بنیاد پر مسلم فقہا میں سے متعدد نے چند صورتوں میں اسقاط کو جائز قرار دیا ہے۔ اسقاط حمل اگرچہ بہت کراہت کی چیز ہے تاہم اگر حمل کے چوتھے ماہ کے آخر

تک ہو تو اس کو جائز رکھا جائے گا۔ تاہم فقہاء کی اکثریت نے اسقاط کو ہر صورت میں ممنوع قرار دیا ہے۔ ہاں ان میں سے کثیر کے ہاں بعض شرائط کے ساتھ ضبط تولید کی اجازت ہے۔ دیکھیے بی مسلم، بیکس ہیڈ سوسائٹی ان اسلام (انگریزی)، کیمبرج یونیورسٹی پریس، کیمبرج، ۱۹۸۳ء۔

۲۷۔ ر۔ک، صحیح مسلم، "ایمان"، ۲۹۱، بحوالہ الکتب الستہ مجموعہ، اقبل، ص ۷۰۹۔

۲۸۔ ر۔ک، صحیح بخاری، "علم"، ۳۸، بحوالہ الکتب الستہ مجموعہ، قبل، ص ۱۲۔ نیز ر۔ک، صحیح مسلم، "رویۃ"، ۱۰۱۔

۲۹۔ ر۔ک، مسند احمد، جلد ۳، ص ۲۵۹

۳۰۔ ر۔ک، صحیح بخاری، "توحید"، ۲۸، بحوالہ الکتب الستہ مجموعہ، قبل، ص ۶۲۱، نیز، صحیح مسلم، "قدر"، ۱۔

۳۱۔ ر۔ک، صحیح بخاری، "توحید"، ۱۵، بحوالہ الکتب الستہ مجموعہ، قبل، ص ۶۱۶، نیز، صحیح مسلم، "توبہ"، ۱۔

۳۲۔ کئی بیشتر علمائے اسلام کی رائے یہ ہے کہ جس شخص تک کوئی پیغام رسالت نہیں پہنچا وہ کسی شریعت کی پابندی کا مکلف نہیں ہے لیکن معاملہ اتنا سادہ نہیں ہے اس میں کئی سوالات چھپے ہوئے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی نشانیاں صرف کتابوں ہی میں ظاہر نہیں کی ہیں، فطرت بھی آیات خداوندی سے معمور ہے۔ بنا بریں بعض علماء نے کہا ہے کہ پیغام نبوت کے بغیر بھی ایک درجہ کی ذمہ داری انسان پر عاید ہوتی ہے کیونکہ انسان ایک ذی اختیار اور ذی عقل مخلوق ہے اور اس کو

اللہ کی نشانیوں کو دیکھنے اور سمجھنے کی صلاحیت دی گئی ہے۔

۳۳۔ ”ہم آکل است و ہم ماکول“

۳۴۔ ر۔ک، صحیح بخاری، ”استئذان“، مطبوعہ مکتب الاسلامی مجموعہ جلد اول، ص، ۵۴۴

۳۵۔ مصنفین نے متن میں myth کا لفظ استعمال کیا ہے اور وضاحت کی ہے کہ یہ لفظ اس معنی و مفہوم میں برتا گیا ہے کہ جو مرسیا ایلیاد اور مطالعۂ مذاہب کے دیگر علماء نے استعمال کیا ہے۔ انگریزی کے عام روزمرہ کے مطابق تو یہ لفظ فرضی قصے اور من گھڑت کہانی کے مترادف ہے اور مصنفین اس کو اس مفہوم میں قطعاً استعمال نہیں کرتے۔ ان کے کہنے کے مطابق myth ہر طرح کے واقعات و معلومات سے زیادہ کھری سچی ہوتی ہے کیونکہ اس کی صداقت ہمیشہ کے لیے معتبر رہتی ہے جبکہ واقعات آتے جاتے رہتے ہیں اور ان کا انحصار بدلتے ہوئے سائنسی اور تاریخی حالات و ظروف پر ہوتا ہے۔ قصہ آدم کو myth کہنے سے مراد یہ ہے کہ یہی وہ کسوٹی اور معیار ہے جس کے حوالے سے مسلمان نوع انسانی کے بارے میں حق و صداقت کا فیصلہ کرتے ہیں۔ اگر کسی کو قصہ آدم یا کسی کی myth کی بنیادی حیثیت کا ادراک نہیں ہے تو اس کا مطلب ہے کہ انہوں نے اس میں مخفی پیغام اور درجۂ معانی کو گرفت میں لانے کی سعی ہی نہیں کی۔ myth کی تہ میں جو روحانی صداقت کارفرما ہوتی ہے وہ تاریخی، تعدادی تجزیے پر بھی درست ہو سکتی ہے اگرچہ یہاں ایک نکتہ قابلِ غور یہ بھی ہے کہ آخر اللہ تعالیٰ کو یہ مجبوری ہے کہ وہ پست مورخ کی تسکین کے لیے تاریخی تفصیلات کا بیان بھی کھول کھول کر کے کیا کرے! تاریخ کا معروضی مطالعہ کرنے والے مورخین بھی تو واقعات کا بیان عین اس طرح نہیں

کرتے جیسے اس کا وقوع ہوا ہوتا ہے۔ ان کا بیانِ واقعات بھی ان کے فہم و قوت کے مطابق اور بس واقعہ نقطۂ نظر سے متاثر ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں بالخصوص انبیاء کے قصوں میں بالعموم ایک خاص مقصد پیشِ نظر ہوتا ہے اور وہ ہے انسان کی فلاح و نجات۔ پس پیغام کی صداقت اس پر مبنی ہوتی ہے کہ اس سے یہ مقصد عمل میں آ سکے، یہ نہیں کہ آغازِ آفرینش اور تخلیقِ آدم کے بارے میں انسانی تجسس کی تسکین ہو جائے یا دنیا کے آغاز کے بارے میں سائنسدانوں اور مورخین کے اختلافِ رائے اور جھگڑوں کا فیصلہ کیا جا سکے۔ ویسے بھی سائنسدانوں کے اور مورخین کے نزدیکی معلومات کی معلومیت تو اس دنیا کے معاملے میں اپنی جگہ پیدا کر سکتی ہے جو خود سائنس اور تاریخ نویسی نے پیدا کی ہو۔ ان حضرات کے پیدا کیے ہوئے یہ عالمِ معانی اور رموز کوئی عالمگیر اور کائناتی حیثیت نہیں رکھتے نہ ان کو معروضیت اور صداقت کا کوئی خاص مقام حاصل ہے۔ دوسری طرف انسان کی نجاتِ اخروی اور فلاح و سعادت کے معاملے سے یہ سب کچھ یوں ہی سرے سے غیر متعلق ہے۔

۳۶۔ ر۔ک صحیح بخاری، مجموعہ ۱ [illegible] کتاب [illegible] محولہ بالا، ص ۷۰۔

۳۷۔ ر۔ک رشید الدین میبدی، کشف الاسرار، تہران، امیر کبیر، جلد ۲، ص ۴-
۸۳۷۔

۳۸۔ یہ مضمون مثنوی مولانا روم کی ابیات میں بھی نقل ہوا ہے۔ دیکھیے مثنوی، دفتر چہارم، ص ۳۶۶۔

۳۹۔ ر۔ک کشف الاسرار محولہ بالا،

۴۰۔ ر۔ک، صحیح مسلم، "قدر"، باب ۲، احادیث ۲۲/۲۳، محولہ [illegible] کتاب [illegible] محولہ

قبل، ص ۱۴۱۔

۴۱۔ حوالہ ہ بالا، ص ۱۴۰۔

۴۲۔ "سابقون" وہ ہیں جو اللہ کے نبی اور اس کے دوست ہیں۔ ان پر صفت خداوندی کی دونوں قسم کی عمدہ تجلی کہ ان میں صورت الٰہیہ اپنے تمام و کمال کو پہنچ چکی ہوتی ہے اور ان میں اللہ کا جلال و جمال کی قدر میں ظہور کرتا ہے جیسے یہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ظاہر ہے۔ وہ صفت جمال سے بھی کی قدر مانوس ہوتے ہیں جتنے صفت جمال سے۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ وہ اس کے نتیجے میں اللہ سے دوری کا کرب اٹھاتے ہیں۔ اس کے برعکس وہ تو اس لحاظ سے خدا سے شناسا ہوتے ہیں۔ اسی طرح اصحاب یمین پر اگرچہ صفت رحمت کا غلبہ ہوتا ہے تاہم وہ "سابقون" کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ سے قریب تر نہیں ہوتے۔ اس لیے کہ ان میں بھی صفت غضب پوری طرح بالفعل ظاہر نہیں ہوتی بلکہ ان میں جنس مماثلت باقی رہ جاتی ہے۔

۴۳۔ دیکھیے، مسند احمد ابن حنبل، ۱۳۳:۲۔

۴۴۔ محولہ ماقبل

۴۵۔ مولانا روم، مثنوی معنوی، نکلسن ایڈیشن، لندن، ۴۰۔۱۹۲۵ء، دفتر اول، شعر ۲۳۸۔

۴۶۔ اس سلسلے میں مزید دیکھیے آیات، ۲:۲۵۵ اور ۳:۸۳۔

۴۷۔ دیکھیے محمد الغزالی، احیاء العلوم الدین، محولہ ماقبل، جلد ۳، ص ۲۲۲، نیز مسند احمد

۱۱۹۰ء۔

۴۸۔ د۔ک، صحیح بخاری، "صلوٰۃ" ۱، بحوالہ الکتب الستہ، محولہ ماقبل، ص ۳۰۔

۴۹۔ د۔ک، صحیح مسلم، "ایمان"، ۳۴۲، بحوالہ الکتب الستہ، محولہ ماقبل، ص ۲۸۳۔

۵۰۔ د۔ک، صحیح ترمذی، "ایمان" ۱۰، بحوالہ الکتب الستہ، محولہ ماقبل، ص، ۱۹۱۰۔ نیز دیکھیے مشکوٰۃ المصابیح، ۲، ۱۰۱۱۔

۵۱۔ حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں یہ اور اسی طرح کی دیگر قرآنی آیات کو پڑھ کر عیسائی حضرات اکثر دنگ رہ جاتے ہیں اور ان میں سے وہ لوگ جو ذرا جذباتی مزاج کے واقع ہوئے ہوتے ہیں وہ ان آیات کو ایک ایسا راستہ سمجھ بیٹھتے ہیں جس کے سہارے اسلام میں نقب لگا کر مسلمانوں کو "صحیح دین" (یعنی ان کی مزعومہ عیسائیت) تک لایا جا سکتا ہے۔ اس سب دلائل بازی کے جواب میں مسلمان بالعموم جمائیاں لینے لگتے ہیں۔ انسانی اوصاف کیسے ہی کیوں نہ ہوں ان پر ایسی ترنگ کی وجہ ان کی سمجھ میں نہیں آتی کیونکہ "الحق الحق"۔ وہ جواباً کہتے ہیں کہ ٹھیک ہے اگر سیدنا عیسیٰؑ کنواری مریم کے بطن سے پیدا ہوئے تھے تو اس سے کیا ہوتا ہے؟ آخر سیدنا آدمؑ بن ماں باپ کے پیدا ہوئے تھے تو کیا ان کو سیدنا عیسیٰؑ سے ایک درجہ اوپر رکھا جائے گا؟ قرآن مجید نے خود آدمؑ و عیسیٰؑ کی مماثلت کی طرف اشارہ کیا ہے "عیسیٰؑ کی مثال اللہ کے نزدیک آدم کی طرح ہے اسے مٹی سے پیدا کیا پھر اس سے کہا، ہو جا اور وہ ہو گیا" (۳: ۵۹)

۵۲۔ دیکھیے ہیچ، اولز رول یاٹج کی معلوماتی درسیاتی کتاب ٹرانسلیٹڈ ورڈز میڈیول مسلم پینٹنگ، بلکہ کریٹی مرحوم، پرنسٹن یونیورسٹی پریس، پرنسٹن ۱۹۶۴ء۔

۵۳۔ حال ہی میں چند نہایت عمدہ کتب لکھی گئی ہیں جن کا موضوع ہے مسلمانوں کا فہم عیسائیت دیکھیے ژاں ماری گوڈارڈ، کیمبرج، ۱۹۹۴ء، نیل رابنسن کرسٹ ان اسلام اینڈ کرسچینٹی، البانی، نیو یارک، سونی پریس، ۱۹۹۱ء۔

۵۴۔ رک، صحیح مسلم، ''مسافرین''، ۱۳۹، بحوالہ الکتب الستہ، محولہ ماقبل، ص، ۷۹۵۔

۵۵۔ رک، غزالی، احیاء، محولہ ماقبل، ۳:۱۷۱۔

۵۶۔ اسلامی روایت میں رسول خدا کی ہمیشہ کیا عظمت اور کیا مقام رہا ہے، یہ دیکھنا ہو تو یہ ماری شمل کی کتاب دیکھیے اور محمدؐ اس کے رسول ہیں، (انگریزی) یونیورسٹی آف نارتھ کیرولینا پریس، ۱۹۸۵ء۔

۵۷۔ رک، غزالی، احیاء، محولہ ماقبل، ۱:۱۴۷۔

۵۸۔ رک، صحیح مسلم، ''منافقین''، ۵۵، بحوالہ الکتب الستہ، محولہ ماقبل، ص، ۱۱۶۷۔ نیز دیکھیے ابن ماجہ ''زہد''، ۳۸۔

۵۹۔ رک، صحیح بخاری، ''طب''، ۵۶، بحوالہ الکتب الستہ، محولہ ماقبل، ص، ۴۹۳۔ نیز دیکھیے مسلم، ''ایمان''، ۱۷۵۔

۶۰۔ رک، صحیح بخاری، ''رقاق''، ۳۹، بحوالہ الکتب الستہ، محولہ ماقبل، ص، ۵۴۶۔ نیز دیکھیے صحیح مسلم ''جمعہ''، ۴۷۔

۶۱۔ رک، صحیح مسلم، ''مسافرین''، ۱۸۷، بحوالہ الکتب الستہ، محولہ ماقبل، ص، ۷۹۷۔

۶۲۔ رک علی بن عثمان ہجویری، کشف المحجوب، ص ۴۳۱۔

۶۳۔ رک صحیح مسلم، "منافقین" ۴۳، بحوالہ الکتب الستہ، محولہ ماقبل، ص ۱۱۶۴۔

۶۴۔ رک صحیح بخاری، "تفسیر" ۹، بحوالہ الکتب الستہ، محولہ ماقبل، ص ۴۷۱۔ نیز دیکھیے صحیح مسلم، "جنۃ" ۵۷۔

۶۵۔ رک مسند احمد، ۲:۳۹۸، ۳:۲۵۷۔

۶۶۔ رک صحیح مسلم، "ایمان" ۳۰۲، بحوالہ الکتب الستہ، محولہ ماقبل، ص ۷۱۰۔ نیز دیکھیے مسند احمد، ۳:۹۴۔

۶۷۔ حوالہ ۱

۶۸۔ رک ترمذی، "جہنم" ۱۰، بحوالہ الکتب الستہ، محولہ ماقبل، ص ۱۹۱۴۔

۶۹۔ رک ابن ماجہ، "مقدمہ" ۱۳۔

۷۰۔ رک صحیح بخاری، "رقاق" ۵۲، بحوالہ الکتب الستہ، محولہ ماقبل، ص ۵۵۰۔ نیز دیکھیے صحیح مسلم، "ایمان" ۳۶۹۔

۷۱۔ قدیم فارسی (پہلوی) کا لفظ "پردیس"۔

۷۲۔ رک صحیح مسلم، "ایمان" ۱۳۴، بحوالہ الکتب الستہ، محولہ ماقبل، ص ۶۹۳۔ نیز دیکھیے ابن ماجہ، "دعا" ۱۰۔

۷۳۔ حوالہ اور انگریزی ترجمے کے لیے دیکھیے ولیم سی چیٹک، صوفی پاتھ

آف دی سٹیٹ یونیورسٹی پریس، ۱۹۸۳ء، ص ۳۔۲۸۳۔

۷۴۔ معاد و آخرت کے بارے میں اسلامی عقائد و تعلیمات کی تفصیل جس طرح مرتب ہوئی ہے اس کے بارے میں جدید اہل علم نے بہت کم لکھا ہے۔ اسلام کے تصور معاد کو انگریزی میں اگر کسی نے ایک اعلیٰ علمی سطح اور نہایت سلجھے ہوئے اسلوب میں بیان کیا ہے تو وہ ہے جیمز موریس کی کتاب حکمت عرشیہ، ملا صدرا کے فلسفے کا ایک تعارف، پرنسٹن، یونیورسٹی پریس، ۱۹۸۱ء۔ آخرت کے بارے میں اسلامی تعلیمات کا طویل مطالعہ ایک اور کتاب میں بھی کیا گیا ہے۔ دیکھیے ولیم سی چیٹک، "معادیات" در اسلامک سپریچولٹی، جلد اول، صفحات ۳۰۹۔۳۷۸۔

۷۵۔ دیکھیے صحیح مسلم، "ایمان" ۲۹۳، بحوالہ الکتب الستہ مجموعہ ماقبل، ص، ۷۰۹۔

۷۶۔ دیکھیے الغزالی، احیاء علوم الدین، ۴:۱۱۳ نیز دیکھیے مشکوٰۃ ۱۳۴۷

۷۷۔ دیکھیے الغزالی، احیاء علوم الدین، ۴:۴۳۵۔

۷۸۔ دیکھیے صحیح مسلم، "جنت" ۴۴، بحوالہ الکتب الستہ مجموعہ ماقبل، ص، ۱۱۷۳۔ نیز دیکھیے مسند احمد، ۲:۳۲۸۔

۷۹۔ دیکھیے ترمذی، "جہنم" ۲، بحوالہ الکتب الستہ مجموعہ ماقبل، ص، ۱۹۱۱ نیز دیکھیے مسند احمد، ۳،۳۲۸؛ مشکوٰۃ ۱۲۱۴۔

۸۰۔ دیکھیے مسند احمد، ۳:۳۸۷؛ نیز مشکوٰۃ، ۳۴۔۳۳۴۔

۸۱۔ دیکھیے الغزالی، احیاء علوم الدین، ۴:۳۸۔

۸۲۔ یہ نہ سمجھیے گا کہ ہم یہاں آ کر اپنی داستان کو بھید و اسرار کے پردے میں چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مقصد صرف یہ کہنا ہے کہ ایک تعارفی نوعیت کی کتاب میں یہ گنجائش نہیں ہوتی کہ فکر اسلامی کے سب سے لطیف و نازک نکتوں کو اس کے صفحات میں بیان کیا جائے۔ "سر القدر" (تقدیر کا بھید) کی تہ میں کیا اصول کارفرما ہیں ان کی ایک جھلک دیکھنی ہو تو ملاحظہ کیجیے چٹک، صوفی پاتھ آف نالج، (۱۹۸۹ء، نیویارک، ۲۰۰۰ء، لاہور)، باب نمبر ۱۷ نیز چٹک، فیتھ اینڈ پریکٹس آف اسلام، ص ۳، ۲۱۳

۸۳۔ ر۔ک، صحیح مسلم، "نذر" ۲۲، بحوالہ الکتب الستہ مجموعہ ماقبل، ص ۱۴۵۔

۸۴۔ دیکھیے نوٹ ۶۷۔

۸۵۔ ہمیں اس نقطے پر اترنے سے گریز ہے۔ اگر یہ پڑھنا چاہیں تو ملاحظہ کیجیے ولیم سی چٹک، فیتھ اینڈ پریکٹس آف اسلام، ص ۶۸

۸۶۔ ر۔ک، ترمذی، "زہد" ۱۱، بحوالہ الکتب الستہ مجموعہ ماقبل، ص، ۸۸۵۔

۸۷۔ ر۔ک، صحیح مسلم، "ذکر" ۳۰، بحوالہ الکتب الستہ مجموعہ ماقبل، نیز دیکھیے ابو داؤد، "وتر" ۲۳، مشکوۃ، ۵۲۴۔

۸۸۔ ہم یہ نہیں کہہ رہے کہ ابو الحسن اشعری اور ان کے مکتب فکر میں ان کے بعد آنے والوں نے تشبیہ و تنزیہ کی اصطلاحات انہی معنی میں استعمال کی ہیں جیسے ہم اس کتاب میں کرتے آئے ہیں۔ یہ اصطلاحی معنی تو ساتویں/تیرہویں صدی میں آ کر

رائج ہوئے۔ ابوالحسن اشعری کے ہاں "تنزیہ" صحیح موقف تھا اور "تشبیہ" ایک بدعت۔ لیکن معاملہ یہ ہے کہ "تنزیہ" اور "تشبیہ" کا جو مفہوم ان کے ذہن میں تھا وہ اس سے خاصا مختلف ہے جو بعد کے زمانوں میں ان اصطلاحات سے حاصل کر لیا

۔

۸۹۔ جدید دنیا میں انسانی قدروں کی جو جی ہوئی ہے اس کا گہرا تعلق اسی عقل پرستی سے ہے۔ بے بودی قدروں میں عقل کا بڑا ہاتھ ہے اس پر ایک مضبوط استدلال جان رالسٹن سال نے قائم کیا ہے۔ دیکھیے، والٹیر کے حرامی، مغرب میں عقل کی ڈکٹیٹر شپ، دی فری پریس، نیویارک، ۱۹۹۲ء۔

۹۰۔ مجلہ علم و تعلیم، (انگریزی) نومبر ۱۹۹۲ء، ص ۸۔۱۷۔

۹۱۔ ابوالحسن الاشعری، الابانہ مشمولہ الرسائل السبع فی العقائد طبع سوم، حیدرآباد دکن، دائرۃ المعارف الاسلامیہ، ۱۹۸۰ء، ص ۴۔۵

۹۲۔ ابن سینا، النجات، مکتبہ السعادۃ، قاہرہ، ۱۹۳۸ء، ص ۳۲۴۔

۹۳۔ "متخیلہ" اور "مفکرہ" کا ابن سینا کے فلسفے میں کیا کردار ہے یعنی بالفاظ دیگر فکر استدلالی اور فکر تمثیلی ہر دو ابن سینا کے ہاں کس طرح ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں اس کا ایک اچھا مطالعہ پیٹر ہیتھ کی کتاب میں ملتا ہے۔ دیکھیے ہیتھ، ایلیگوری اینڈ فلاسفی ان ابن سینا، یونیورسٹی آف پنسلوینیا پریس، ۱۹۹۲ء۔

۹۴۔ سہروردی المقتول، مجموعہ آثار فارسی، مرتبہ سید حسین نصر، کاوش فلسفہ، تہران، ۱۹۷۷ء، ص ۹۸۔۲۹۷۔ نیز دیکھیے تھیکسٹن، سہروردی دی اشراقی متصوفانہ تصنیف

۱۵۔ دو کشن گن پریس، اشاعت ۱۹۸۲ء، ص ۸۔

حصہ سوم

احسان

۱۔ ر۔ک، مسند احمد، ۱:۳۰۳

۲۔ ر۔ک، صحیح البخاری، ''ایمان'' ۳۱ بحوالہ الکتب الستہ بحولہ ماقبل، ص، ۵۔

۳۔ ر۔ک، ابوداؤد، ''ادب'' ۶۱، بحوالہ الکتب الستہ، بحولہ ماقبل، ص، ۱۵۷۵۔

۴۔ ر۔ک، صحیح المسلم، ''صید'' ۵۷، بحوالہ الکتب الستہ، بحولہ ماقبل، ص، ۱۰۲۷۔

۵۔ محمد الغزالی، احیاء، ۱:۳۳۱

۶۔ ر۔ک صحیح المسلم، ''جنۃ'' ۳۱، بحوالہ الکتب الستہ بحولہ ماقبل، ص، ۱۱۷۲۔

۷۔ ر۔ک، ترمذی، ''دعوت''، ۱۱۷؛ مشکوۃ المصابیح، ۴۲۷

۸۔ دیکھیے علی ابن الحسین، الصحیفۃ الکاملۃ السجادیۃ، انگریزی ترجمہ، The Psalms of Islam از ولیم سی چیٹک، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۸۸ء، ص ۲۳۰۷۔

۹۔ قرآنی تعلیمات اور اسلامی آرٹ کے مابین تعلق کو سمجھنا ہو تو ابراہیم عزالدین (Titus Burckharat) کی تحریریں دیکھیے مثلاً آرٹ آف اسلام، لندن،

۱۹۷۶ اور فاس۔ شہر اسلام، اسلامک ٹیکسٹ سوسائٹی، کیمبرج ۱۹۹۲ء نیز سید حسین نصر اسلامک آرٹ اینڈ سپر چیولیٹی، سہیل اکیڈمی، لاہور ۱۹۹۸ء اس ضمن میں اے جے گلاسی کی کتاب ترکی کا موجودہ روایتی آرٹ (انگریزی) انڈیانا یونیورسٹی پریس، ۱۹۹۳ء ایک غیر معمولی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ اس میں مصنف نے اس بات کی وافر شہادت فراہم کر دی ہے کہ اسلام کے مطلوبہ انسانی کمالات کس طرح آج کے فنکار کے روزمرہ معمولات میں سرایت کیے رہتے ہیں۔

۱۰۔ آج بھی سینما اور روڈیو کی دنیا میں قرأت اور تجوید عالم اسلامی کی فنی ہیئتوں میں سے سب سے بڑا فن ہے۔ قرآن کے ایسے قاری بھی ہیں جن کی تنخواہیں فلمی ستاروں سے زیادہ ہیں۔ تجوید اور قرأت کا فن کیا ہوتا ہے اس کے لیے دیکھیے کے نیلسن، قرأت قرآن کا فن، (انگریزی) یونیورسٹی آف ٹیکساس پریس، ۱۹۸۵۔

۱۱۔ خطاطی کی اہمیت کے لیے دیکھیے اینا ماری شمل، کیلی گرافی اینڈ اسلامک کلچر، نیو یارک، یونیورسٹی پریس، ۱۹۸۴ء۔ قرآنی خطاطی کی توضیح اور نمونوں کے لیے دیکھیے، ابوبکر سراج الدین (مارٹن لنگز)، قرآن کا فن خطاطی اور تذہیب (انگریزی)، لندن، ۱۹۷۶ء

۱۲۔ ر۔ ک، صحیح مسلم، "مساجد"، ۴ بحوالہ الکتب الستۃ، محولہ ماقبل، ص، ۷۵۹۔

۱۳۔ ارل ایچ واگ نے شعری تاثیر اور عشق خداوندی کو بیدار کرنے میں شاعری کے کردار کے کئی اسباب گنوائے ہیں۔ دیکھیے ان کا مطالعہ مصر کے منشدین، ان کی کائنات اور ان کا گانا (انگریزی) یونیورسٹی آف ساؤتھ کیرولینا پریس، ۱۹۸۹ء اس

کتاب میں انہوں نے معاصر مصری صوفیاء کے ہاں شعر اور موسیقی کے استعمال کا مطالعہ کیا ہے۔

۱۴۔ مثنوی مولانا روم، دفتر سوم، اشعار ۶۰۔ ۵۲۵۔

۱۵۔ محمد الغزالی، احیاء، ۲۴۹: ۵۔

۱۶۔ ر۔ک، باربرا میٹکاف، مورل کنڈکٹ اینڈ اتھارٹی، دی پلیس آف ادب ان ساؤتھ ایشین اسلام، یونیورسٹی آف کیلی فورنیا پریس، ۱۹۸۴ء، ص ۳۔

۱۷۔ ایضاً، ص ۹۔

۱۸۔ ایضاً، ص ۱۰۔

۱۹۔ مثنوی مولانا روم، دفتر دوم، شعر ۱۸۵۳۔

۲۰۔ شعر کے عمومی علائم و رموز اور لفظیات کی وضاحت کے لیے دیکھیے اینا ماری شمل A Two Coloured Brocade The Imagery of Persian Poetry، یونیورسٹی آف ساؤتھ کیرولینا پریس، ۱۹۹۲ء۔

۲۱۔ ر۔ک رشید الدین المیبدی، کشف الاسرار، تدوین، علی اصغر حکمت، دانشگاہ تہران، ۶۰۔ ۱۹۵۲ء، جلد سوم، صفحات ۵۵۔ ۱۵۴۔

۲۲۔ ان مباحث میں تذکیر و تانیث کو بطور علامت کیوں برتا جاتا ہے۔ اس کے مضمرات کا جائزہ لینا ہو تو دیکھیے ساچیکو مراتا، دی ڈاؤ آف اسلام اے سورس بک آن جینڈر ریلیشن شپ ان اسلام، (انگریزی)، سہیل اکیڈمی، لاہور، ۲۰۰۰ء۔

۲۳۔ ر۔ک ابن ماجہ "زہد" ۱۷ بحوالہ الکتب الستہ محولہ ماقبل، ص، ۲۷۳۱۔

۲۴۔ ماخوذ از صوفی پاتھ آف لو، تصنیف ولیم چیٹک صفحات ۲۱۲،۵۳،۱۵۲۔

۲۵۔ الیف۔ای۔پیٹرز محولہ ماقبل، ص xix۔

۲۶۔ اس عبارت میں جن مستشرقین کے نام آتے ہیں وہ اسلامی تہذیب اور اس کی سیاسی اور فکری تاریخ کے مختلف شعبوں کے ماہرین کہلاتے ہیں۔(مترجم)

۲۷۔ سلیوان محولہ ماقبل، ص ۷۹۔۶۷۸۔

۲۸۔ ر۔ک، صحیح مسلم، "ایمان" ۲۳۴ بحوالہ الکتب الستہ محولہ ماقبل، ص، ۷۰۲۔

۲۹۔ ر۔ک ابن ماجہ "زہد"، ۵، بحوالہ الکتب الستہ محولہ ماقبل، ص، ۲۷۲۷۔

۳۰۔ ر۔ک، صحیح بخاری، "فتن"، ۶، بحوالہ الکتب الستہ محولہ ماقبل، ص، ۵۹۰۔

۳۱۔ آج اگر معاملہ کچھ بدل رہا ہے اور لوگ بیاشیاء یونہی اٹھا کر نہیں پھینکتے تو اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ انھیں ان اشیاء کی جمالی حیثیت اور ان کے حسن کا احساس ہو گیا ہے۔ انھیں صرف یہ پتہ چل گیا ہے مغربی سیاح ایسی چیزیں شوق سے خرید لیتے ہیں۔ اکثر ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ جن مسلمانوں میں اپنی میراث فن کے حسن و جمال کا احساس پیدا ہوا، وہ بالعموم مغربی تعلیم کے وسیلے سے ان تک پہنچے تھے۔ یہی مغرب زدہ مخصوص طبقہ عجائب گھر اور آرٹ گیلریاں چلاتے ہیں نہ کہ وہ چند مسلمان جن کا احساس جمال کبھی کند نہیں ہوا تھا۔

THE END ------------------ ختم شد ----------